تحریکِ اسلامی
کامیابی کے شرائط

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترتیب

- تمہید ۵
- **انفرادی اوصاف** ۹
  - اسلام کا صحیح مفہوم ۹
  - اسلام پر پختہ ایمان ۱۰
  - سیرت و کردار ۱۱
  - دین بہ حیثیت مقصد ۱۱
- **اجتماعی اوصاف** ۱۳
  - اخوت و محبت ۱۳
  - باہمی مشاورت ۱۴
  - نظم و ضبط ۱۴
  - تنقید بہ غرضِ اصلاح ۱۵
- **تکمیلی اوصاف** ۱۶
  - تعلق باللہ اور خلوص ۱۷
  - فکرِ آخرت ۱۷
  - حسنِ سیرت ۱۸
  - صبر و استقامت ۱۹
  - حکمت ۲۱
- **بنیادی عیوب** ۲۴
  - کبر و غرور ۲۴

احساسِ بندگی ۲۵
محاسبۂ نفس ۲۵
اعلیٰ افراد پر نظر ۲۶
نمود و نمائش ۲۶
انفرادی کوشش ۲۸
اجتماعی کوشش ۲۸
نیت کا کھوٹ ۲۹
• انسانی کمزوریاں ۳۱
نفسانیت ۳۱
خود پسندی ۳۲
توبہ و استغفار ۳۴
کلمۂ حق کا اظہار ۳۵
بغض و حسد ۳۶
بدگمانی ۳۶
غیبت ۳۶
چغل خوری ۳۸
کھسر پھسر اور سرگوشیاں ۳۸
مزاج کی بے اعتدالی ۴۱
یک رخا پن ۴۲
انتہا پسندی ۴۳
اجتماعی بے اعتدالی ۴۳
تنگ دلی ۴۶
ضعفِ ارادہ ۴۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱
تمہید

جو افراد سنجیدگی کے ساتھ یہ چاہتے ہیں کہ ملک میں ایک مثالی اسلامی معاشرہ وجود میں آئے، انھیں سب سے پہلے جو بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں اس کے لیے خواہش کی کوئی کمی نہیں۔ اصل کمی آمادگی کی ہے اور اس سے بھی زیادہ کمی استعداد کی۔ بیش تر لوگ ان کم سے کم بنیادی اوصاف سے بھی خالی ہیں، جن کا ہونا اس کام کے لیے ناگزیر ہے۔ دوسری بات جس پر نگاہ رکھنی چاہیے یہ ہے کہ ہماری قوم کے اندر جتنے بااثر عناصر پائے جاتے ہیں وہ زیادہ تر بگاڑ کے لیے کام کر رہے ہیں اور جو بگاڑنے میں لگے ہوئے نہیں ہیں وہ سنوارنے کی فکر سے بھی فارغ ہیں، اصلاح و تعمیر کے لیے کوشش کرنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ تیسری بات جس سے غافل نہ رہنا چاہیے یہ ہے کہ موجودہ دور میں اجتماعی زندگی کو بنانے اور بگاڑنے والی سب سے بڑی طاقت حکومت ہے اور جس جگہ جمہوری نظام رائج ہو وہاں حکومت کے صحیح یا غلط ہونے کا سارا انحصار اس امر پر ہے کہ عوام الناس صحیح آدمیوں کے ہاتھ میں اقتدار سونپتے ہیں یا غلط آدمیوں کے ہاتھ میں۔ بگاڑ کے لیے کام کرنے والے تمام لوگ کسی دوسرے کام پر اتنی طاقت صرف نہیں کرتے جتنی اس سلسلے میں عوام کو بہکانے پر صرف کرتے ہیں تاکہ وہ کبھی صحیح انتخاب کرنے کے قابل نہ ہو سکیں۔

یہ تین حقیقتیں مل جل کر ایک ایسا بھیانک منظر پیش کرتی ہیں کہ ایک دفعہ تو اسے دیکھ کر آدمی کا دل بیٹھ جاتا ہے اور وہ مایوسی کے ہجوم میں سوچنے لگتا ہے۔ یہاں کچھ بنائے بھی بن سکے گا یا نہیں؟ لیکن اس کے مقابلے میں چند حقیقتیں اور بھی ہیں جنھیں نگاہ میں رکھنے سے یاس کے بادل چھٹنے لگتے ہیں اور امید کی شعاعیں چمکنا شروع ہو جاتی ہیں۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ

صرف فاسد عناصر ہی سے بھرا ہوا نہیں ہے بلکہ اس میں کچھ صالح عناصر بھی موجود ہیں، ان کے اندر اصلاح و تعمیر کی صرف خواہش ہی نہیں بلکہ آمادگی و استعداد بھی پائی جاتی ہے اور اگر اس میں کچھ کمی ہے تو وہ تھوڑی سی توجہ اور سعی سے پیدا کی جاسکتی ہے۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم بہ حیثیتِ مجموعی شر پسند نہیں ہے، بے علمی اور نادانی کی وجہ سے وہ دھوکا کھا سکتی ہے اور کھا رہی ہے، لیکن وہ اس بگاڑ پر راضی نہیں ہے جو دھوکا دینے والوں کے ہاتھوں رونما ہوتا ہے، اگر حکمت کے ساتھ منظم اور پیہم سعی کی جائے تو یہاں کی رائے عام کو اصلاح پسند طاقتوں کا مؤید بنانے میں بالآخر کامیابی ہو کر رہے گی۔ مایوسی صرف اس صورت میں ہو سکتی تھی کہ قوم کا سوادِ اعظم خود ان برائیوں کا طالب ہوتا، جو معاشرے میں مفسد طاقتوں کے غلبے سے برباد ہو رہی ہیں۔ تیسری حقیقت یہ ہے کہ بگاڑ کے لیے کام کرنے والوں کو سب کچھ میسر ہے مگر دو چیزیں میسر نہیں ہیں، ایک سیرت و کردار کی طاقت، دوسرے اتحاد و اتفاق۔

آخری اور سب سے اہم حقیقت یہ ہے کہ اقامتِ دین کا کام اللہ تعالیٰ کا اپنا کام ہے اور اس کے لیے جو لوگ بھی کوشش کریں ان کو اللہ کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ بہ شرطے کہ وہ اخلاص اور صبر کے ساتھ کام کریں اور حکمت سے غافل نہ ہوں۔ ایسے لوگوں کی تعداد خواہ کتنی ہی کم ہو اور ان کے وسائل چاہے کتنے ہی قلیل ہوں، آخر کار اللہ کی تائید ہر کسر پوری کر دیتی ہے۔

مایوس کن ظاہر کے پیچھے امید کا یہ سروسامان ہے، جو ڈھارس بندھاتا ہے کہ ملک میں ایک مثالی اسلامی معاشرے کا وجود ممکن ہی نہیں بلکہ اس کا فائز المرام ہونا بھی متوقع ہے۔ البتہ ضرورت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ جو افراد بھی اس کام کی حقیقی خواہش رکھنے والے موجود ہیں وہ آرزوؤں اور تمناؤں کی منزل سے نکل کر کچھ کرنے کے لیے آگے بڑھیں اور ان طریقوں سے کام کریں جو سنت اللہ کے مطابق کامیابی کے لیے مقرر ہیں۔ سنت اللہ یہ نہیں ہے کہ آپ بس خرابیوں پر تنقید کرتے رہیں اور وہ محض آپ کی باتوں سے دور ہو جائیں۔ جنگل کا ایک کانٹا اور راستے کا ایک روڑا بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا جب تک آپ ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں۔ پھر بھلا معاشرے میں مدتوں کی رچی بسی خرابیاں محض زبان کے پھاگ اڑانے سے کیسے رفع ہو جائیں گی۔ گیہوں کا ایک دانہ بھی کسان کی عرق ریزی کے بغیر پیدا نہیں ہوتا، پھر کیسے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ معاشرے میں خیرات و حسنات کی کھیتی بس دعاؤں اور تمناؤں سے لہلہانے لگے گی۔

تنقیدیں کارگر ہوتی ہیں مگر اس وقت جب کہ عالمِ اسباب میں ہم اپنے کرنے کا کام پورا کر دیں اور پھر اس کے بارآور ہونے کے لیے اللہ سے دعائیں مانگیں۔ فرشتے بلاشبہ اترتے ہیں مگر خود سے لڑنے کے لیے نہیں بلکہ ان اہلِ حق کی مدد کے لیے اترتے ہیں جو خدا کی راہ میں جانیں لڑا رہے ہوں، پس جو لوگ بھی عمل کے لیے کوئی آمادگی اپنے اندر رکھتے ہوں انھیں غلط توقعات اور بے جا امیدوں کو چھوڑ کر ٹھنڈے دل سے اس کام کے تقاضوں کو سمجھنا چاہیے اور پھر خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے کہ انھیں یہ کام کرنا ہے، یا پھر بگاڑ پر نوحہ خوانی کرنے اور بناؤ کی آرزوئیں دل میں پالنے پر قناعت کرنی ہے۔ عمل کا فیصلہ جسے بھی کرنا ہو جوش میں آکر نہیں بلکہ ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ وقتی جوش میں یہ طاقت تو ضرور ہے کہ آدمی اٹھے اور سینے پر گولی کھا کر جان دے دے لیکن اس میں یہ طاقت نہیں ہے کہ آدمی کو چار دن بھی کسی ایک برائی سے اجتناب یا ایک بھلائی کے التزام پر قائم رکھ سکے، کجا کہ اس کے بل بوتے پر کوئی شخص عمر بھر ایک مقصد کے پیچھے لگا تار محنت کرتا چلا جائے۔ تعمیری کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا سوچا سمجھا فیصلہ یہ ہو کہ انھیں اپنی عمر عزیز اسی کام میں کھپانی ہے۔

آمادگیِ عمل کے بعد لوگ عموماً لائحۂ عمل کے سوال پر آجاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اچھا، ہم نے کام کا فیصلہ کر لیا۔ اب بتاؤ کہ وہ پروگرام کیا ہے، جس پر ہم کام کریں۔ لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ فیصلۂ عمل اور لائحۂ عمل کے درمیان مدارِ کار خود عامل کی ذات ہے، جس کو نظر انداز کر کے کام اور پروگرام کی باتیں شروع کر دینا صحیح نہیں ہے۔ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ عمل کے لیے صرف ارادۂ عمل کافی ہے، جس کے بعد بس ایک لائحۂ عمل ہی کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر ہمارے ہاں بڑے بڑے کام شروع ہوئے اور آخر کار نتیجۂ مطلوب تک پہنچنے میں ناکام ہو کر رہ گئے۔ اصل چیز پروگرام اور اسکیم نہیں، بلکہ اس کے چلانے والے لوگ ہیں، ان کے اوصاف۔ ایک ایک فرد کے ذاتی اوصاف بھی اور سب کے اجتماعی اوصاف بھی۔ وہ اصل طاقت ہیں جو اس امر کا فیصلہ کرتے ہیں کہ اس اسکیم یا پروگرام کو کامیاب ہونا ہے یا ناکام۔ ان کی ہر کمزوری نتائج پر اثر انداز ہوتی ہے اور ہر خوبی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ وہ عمدہ اوصاف کے مالک ہوں تو ایک غلط اسکیم اور برے لائحۂ عمل کو بھی ایک دفعہ تو اس طرح چلا کر دکھا دیتے ہیں کہ دنیا دنگ رہ جاتی ہے، بہ خلاف اس کے اگر ان کی صلاحیت ناقص ہو تو بہتر سے بہتر کام بھی بگڑ جاتا ہے، حتیٰ کہ دنیا کو خود

اس کام کی صحت میں بھی شک ہو جاتا ہے جسے عمل میں لانے کے لیے نااہل لوگ میسر آئے ہوں۔ لہٰذا ہمیں تعمیر و اصلاح کی عملی تجاویز پر غور کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کام کے لیے جو لوگ آگے بڑھیں انھیں کن صلاحیتوں سے آراستہ، کن اوصاف سے متصف اور کن عیوب سے پاک ہونا چاہیے، اور یہ کہ اس طرح کے آدمیوں کی تیاری کے ذرائع کیا ہیں؟

آئندہ صفحات میں ہم اس مضمون کو حسبِ ذیل ترتیب کے ساتھ بیان کریں گے:

(۱) وہ اوصاف جو اس مقصد کے لیے کام کرنے والے ہر فرد میں بہ ذاتِ خود ہونے چاہئیں۔

(۲) وہ اوصاف جو ان کے اندر من حیث الجماعت ہونے چاہییں۔

(۳) وہ اوصاف جو دعوت و تبلیغ اور اقامتِ دین کی جدّوجہد میں کامیاب ہونے کے لیے درکار ہیں۔

(۴) وہ بڑی بڑی برائیاں جن سے ان کو فرداً فرداً اور من حیث الجماعت پاک ہونا چاہیے۔

(۵) وہ تدابیر جن سے مطلوبہ اوصاف کے نشو و نما اور نامحمود اوصاف سے افراد اور جماعت کے تزکیہ میں مدد لی جاسکتی ہے۔

دنیا میں عملاً اسلامی نظام زندگی قائم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد کے بعد دوسری اہم ترین چیز جس پر کامیابی کا انحصار ہے وہ اس کام کی سعی کرنے والوں کے اپنے اوصاف ہیں۔ چند اوصاف ایسے ہیں جو فرداً فرداً ان میں سے ہر ایک ذات میں ہونے چاہئیں۔ چند دوسرے اوصاف ان کے اندر اجتماعی طور پر پائے جانے چاہئیں۔ چند اور اوصاف اصلاح و تعمیر کی خدمت انجام دینے کے لیے ضروری ہیں اور چند برائیاں ایسی ہیں جن سے اگر وہ اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھیں تو ان کے سارے کیے دھرے پر پانی پھر سکتا ہے۔ ان امور کو سب سے پہلے ذہن نشین ہونا چاہیے، تاکہ وہ تمام لوگ جو اس خدمت کا سچا جذبہ رکھتے ہیں، اپنے اندر مطلوب اوصاف کی پرورش کرنے اور نامطلوب اوصاف سے اپنے آپ کو پاک کرنے کی طرف خاص طور سے متوجّہ ہوں۔ تعمیرِ معاشرہ کے لیے یہ تعمیرِ ذات شرطِ اول ہے کیوں کہ جو خود نہ سنورے وہ دوسروں کو سنوارنے کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔

(۲)

انفرادی اوصاف

اسلام کا صحیح فہم

انفرادی اوصاف میں سب سے پہلی چیز اسلام کا صحیح فہم ہے۔ جو آدمی اسلامی نظامِ زندگی کو برپا کرنا چاہتا ہو، اُسے پہلے خود اس چیز کو اچھی طرح جاننا اور سمجھنا چاہیے، جسے وہ برپا کرنا چاہتا ہے۔ اس غرض کے لیے اسلام کا محض اجمالی علم کافی نہیں ہے، بلکہ کم وبیش تفصیلی علم درکار ہے، اور اس کی کمی وبیشی آدمی کی استعداد پر موقوف ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس راہ کا ہر رہرو اور اس تحریک کا ہر کارکن مفتی یا مجتہد ہو۔ لیکن یہ بہ ہر حال ضروری ہے کہ ان میں سے ہر ایک اسلامی عقائد کو جاہلی افکار واوہام سے اور اسلامی طرزِ عمل کو جاہلیت کے طور طریقوں سے ممیّز کر کے جان لے، اور اس بات سے واقف ہو جائے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلام نے انسان کو کیا رہ نمائی دی ہے۔ اس علم وواقفیت کے بغیر نہ آدمی خود صحیح راہ پر چل سکتا ہے، نہ دوسروں کو راستہ دکھا سکتا ہے اور نہ تعمیرِ معاشرہ کے لیے کوئی کام صحیح خطوط پر کر سکتا ہے۔ عام کارکنوں کو یہ واقفیت اس حد تک ہونی چاہیے کہ وہ دیہاتی اور شہری عوام کو سیدھے سادھے طریقے سے دین سمجھا سکیں، لیکن عمدہ ذہنی صلاحیتیں رکھنے والے لوگوں کو اس میں اتنا درک بہم پہنچانا چاہیے کہ وہ ذہین طبقوں کو متاثر کر سکیں، تعلیم یافتہ لوگوں کے شکوک اور الجھنیں رفع کر سکیں، مخالفین کے اعتراضات کا مدلّل اور اطمینان بخش جواب دے سکیں، زندگی کے مختلف النوع مسائل کو اسلام کی روشنی میں حل کر سکیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے علوم وفنون کی تدوینِ جدید کر سکیں، اور اسلام کی ازلی وابدی بنیادوں پر

ایک نئی تہذیب اور نئے تمدّن کی عمارت اُٹھا سکیں۔ ان میں اتنی تنقیدی صلاحیت ہونی چاہیے کہ موجودہ زمانے کے نظامِ فکر و عمل میں سے سقیم اجزا کو سلیم اجزا سے الگ کر سکیں، اور ساتھ ساتھ اتنی تعمیری صلاحیت بھی ہونی چاہیے کہ جو کچھ توڑنے کے لائق ہے، اُسے توڑ کر ایک بہتر چیز اس کی جگہ بنا سکیں اور جو کچھ رکھنے کے لائق ہے اُسے باقی رکھ کر ایک بہتر نظام میں اس کو استعمال کر سکیں۔

اسلام پر پختہ ایمان

علم و معرفت کے بعد دوسرا ضروری وصف، جو اس مقصد کے لیے کام کرنے والوں میں ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ جس دین پر وہ نظامِ زندگی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں وہ خود اس پر پختہ ایمان رکھتے ہوں، ان کا اپنا دل اس کے صحیح و برحق ہونے پر مطمئن ہو اور ان کا اپنا ذہن اس معاملے میں پوری طرح یک سو ہو جائے۔ شک، تذبذب اور تردد لیے ہوئے کوئی شخص اس کام کو نہیں کر سکتا۔ دماغی الجھنیں اور نظر و فکر کی پراگندگیاں لے کر یہ کام نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی ایسا آدمی اس کام کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا، جس کا دل ڈانوا ڈول ہو۔ جس کا ذہن یکسو نہ ہو اور جسے خیال و عمل کی مختلف راہیں اپنی طرف کھینچ رہی ہوں یا کھینچ سکتی ہوں۔ یہ کام تو جسے بھی کرنا ہو اُسے قطعی طور پر اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ خدا ہے اور انھی صفات سے متصف، انھی اختیارات کا مالک، اور انھی حقوق کا مستحق ہے، جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ آخرت ہے اور ٹھیک ٹھیک ویسی ہے جیسی قرآن میں بتائی گئی ہے۔ راہِ راست صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے، جو محمد ﷺ نے دکھائی ہے۔ ہر وہ چیز باطل ہے، جو اس کے خلاف ہو، یا اس سے موافقت نہ رکھتی ہو، جو خیال بھی کسی دوسرے نے پیش کیا ہے اور جو طریقہ بھی دوسرے نے نکالا ہے اس کو جانچنے کی کسوٹی صرف ایک ہے اور وہ ہے اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت۔ اس کسوٹی پر جو کھرا اترے وہ کھرا ہے، اور جو کھوٹا اُترے وہ کھوٹا ہے، اسلامی نظامِ زندگی کی تعمیر کے لیے ان حقیقتوں پر پختہ یقین درکار ہے۔ دل کا پورا اطمینان درکار ہے۔ دماغ کی کامل یکسوئی درکار ہے۔ جو لوگ اس معاملے میں ادنیٰ تذبذب بھی رکھتے ہوں، یا جن کی دل چسپیاں ابھی دوسری راہوں سے وابستہ ہوں، انھیں اس عمارت کے معمار بن کر آنے سے پہلے اپنی اس کم زوری کا علاج کرنا چاہیے۔

سیرت و کردار

تیسرا لازمی وصف یہ ہے کہ آدمی کا عمل اس کے قول کے مطابق ہو۔ جس چیز کو وہ حق مانتا ہے اس کا اتباع کرے، جس کو باطل قرار دیتا ہے اس سے اجتناب کرے، جسے اپنا دین کہتا ہے اسے اپنی سیرت و کردار کا دین بنائے اور جس چیز کی طرف وہ دنیا کو دعوت دیتا ہے سب سے پہلے خود اس کی پیروی اختیار کرے۔ اُسے اوامر کے اتباع اور نواہی سے اجتناب کے لیے کسی خارجی دباؤ یا اثر کا محتاج نہ ہونا چاہیے۔ صرف یہ چیز کہ ایک کام اللہ کی خوش نودی کا موجب ہے اس بات کے لیے کافی ہونی چاہیے کہ وہ دلی رغبت و شوق کے ساتھ اسے کرے اور صرف یہ بات کہ ایک کام اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے اس حد تک موثر ہونی چاہیے کہ وہ اس سے رُک جائے۔ اس کی یہ کیفیت صرف معمولی حالات ہی میں نہ ہونی چاہیے، بلکہ اس کی سیرت میں اتنی طاقت ہونی چاہیے کہ وہ غیر معمولی بگاڑ کے ماحول میں ہر خوف اور ہر لالچ کا مقابلہ کرے اور ہر مزاحمت سے نبرد آزما ہو کر بھی راہِ راست پر ثابت قدم رہ سکے۔ جو لوگ اِس وصف سے خالی ہوں، وہ اصلاح و تعمیر میں مددگار تو ہو سکتے ہیں، مگر اس کے اصل کارکن نہیں ہو سکتے۔ اس کام میں مددگار تو ہر وہ شخص ہو سکتا ہے، جو اسلام کے لیے کوئی عقیدت اپنے اندر رکھتا ہے۔ بلکہ جو منکر اور مخالف مزاحم نہیں ہے وہ بھی ایک حد تک مددگار ہے۔ لیکن ایسے مددگار چاہے کروڑوں کی تعداد میں بھی موجود ہوں تو عملاً اسلامی نظام برپا نہیں ہو سکتا اور جاہلیت کے فروغ کی رفتار رک نہیں سکتی۔ عملاً یہ کام صرف اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اسے کرنے کے لیے ایسے لوگ اٹھیں، جو علم و یقین کی نعمت کے ساتھ سیرت و کردار کی طاقت بھی رکھتے ہوں اور جن کے ایمان و ضمیر میں اتنی زندگی موجود ہو کہ وہ کسی خارجی محرک کے بغیر خود اپنی اندرونی تحریک سے دین کے تقاضے پورے کرنے لگیں۔ اس طرح کے کارکن برسرِ کار آجائیں تو ان بہت سے ہمدردوں اور مددگاروں کی موجودگی بھی اپنا فائدہ دے سکتی ہے، جو مسلم معاشرے ہی میں نہیں، غیر مسلم معاشرے تک میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

دین بہ حیثیت مقصد

ان تین صفات کے ساتھ ایک چوتھی صفت بھی اصلاح و تعمیر کے کارکنوں میں پائی جانی چاہیے، اور وہ یہ ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامتِ دین ان کے لیے محض ایک خواہش اور تمنا کا

درجہ نہ رکھتی ہو بلکہ وہ اسے اپنی زندگی کا مقصد بنائیں۔ ایک قسم کے لوگ تو وہ ہوتے ہیں، جو دین سے واقف ہوتے ہیں، اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں مگر اس کو قائم کرنے کی سعی و جہد ان کا وظیفۂ زندگی نہیں ہوتا بلکہ وہ نیکی اور نیک عمل کے ساتھ اپنی دنیا کے معاملات میں لگے رہتے ہیں۔ یہ بلاشبہ صالح لوگ ہیں اور اگر اسلامی نظامِ زندگی عملاً قائم ہو چکا ہو تو یہ اس کے اچھے شہری ہو سکتے ہیں، لیکن جہاں نظامِ جاہلیت پوری طرح چھایا ہوا ہو اور کام یہ درپیش ہو کہ اُسے ہٹا کر نظامِ اسلام اس کی جگہ قائم کرنا ہے۔ وہاں صرف اِس درجے کے نیک لوگوں کی موجودگی سے کچھ نہیں بن سکتا، وہاں ضرورت ان لوگوں کی ہوتی ہے، جن کے لیے یہ کام عین اُن کا مقصدِ زندگی ہو، وہ دنیا کے دوسرے کام تو جینے کے لیے کریں، مگر ان کا جینا صرف اس ایک مقصد کے لیے ہو، اس مقصد میں وہ مخلص ہوں، اسی کی لگن ان کے دل کو لگی ہوئی ہو۔ اس کے حصول کی کوشش کا وہ پختہ عزم رکھتے ہوں۔ اس کام میں اپنا وقت، اپنا مال، اپنے جسم و جان کی قوتیں اور اپنے دل و دماغ کی صلاحیتیں کھپا دینے کے لیے وہ تیار ہوں، حتیٰ کہ اگر سر دھڑ کی بازی لگا دینے کی ضرورت پیش آجائے تو وہ اس سے بھی منہ نہ موڑیں۔ جاہلیت کے جنگل کو کاٹ کر اسلام کی راہ ہموار کرنا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔

یہ اوصاف: دین کا صحیح فہم، اس پر پختہ ایمان، اس کے مطابق سیرت و کردار اور اس کی اقامت کو مقصدِ زندگی بنانا ــــ وہ بنیادی اوصاف ہیں، جو فرداً فرداً ان تمام لوگوں میں موجود ہونا چاہئیں، جو اسلامی نظامِ زندگی کی تعمیر کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہوں۔ ان کی اہمیت یہ ہے کہ اگر ان اوصاف کے حامل افراد بہم نہ پہنچیں تو اس کام کا سرے سے تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اب یہ کہنے کی کوئی حاجت نہیں ہے کہ اس طرح کے افراد کا اگر وہ فی الواقع کچھ کرنا چاہتے ہوں، مل کر ایک جماعت کی صورت میں کام کرنا بہ ہر حال ضروری ہے قطع نظر اِس کے کہ وہ کس جماعت میں ملیں اور کس نام سے کام کریں۔ ہر صاحبِ عقل آدمی اس بات کو خود جانتا ہے کہ اجتماعی نظام میں کوئی تغیر محض انفرادی کوششوں سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے بکھری ہوئی مساعی نہیں بلکہ سمٹی ہوئی مساعی درکار ہوتی ہے لہٰذا اسے ایک مسلّم حقیقت فرض کرتے ہوئے اب ہم ان اوصاف کو لیتے ہیں، جو اس طرح کی جماعت میں من حیث الجماعت پائے جانے چاہئیں۔

(۳)

اجتماعی اوصاف

اخوت ومحبت

ایسی جماعت کا اوّلین وصف یہ ہونا چاہیے کہ اس کے شرکاء آپس میں محبت کرنے والے ہوں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ایثار کا معاملہ کریں، جس طرح ایک عمارت اسی وقت مستحکم ہوسکتی ہے جب کہ اس کی اینٹیں باہم مضبوطی کے ساتھ پیوستہ ہوں اور اینٹوں کو جوڑنے والی چیز سیمنٹ ہے۔ اسی طرح ایک جماعت بھی اس وقت بنیان مرصوص بنتی ہے جب کہ اس کے ارکان کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں اور دلوں کو جوڑنے والی چیز مخلصانہ محبت ہے۔ آپس کی خیر خواہی اور ہم دردی ہے، اور ایک دوسرے کے ساتھ ایثار کا معاملہ ہے، نفرت کرنے والے دل کبھی نہیں مل سکتے۔ منافقانہ میل جول کوئی حقیقی اتحاد پیدا نہیں کرسکتا۔ خودغرضانہ اتحاد نفاق کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور محض ایک روکھا سوکھا کاروباری تعلق کسی رفاقت کی بنیاد نہیں ہوسکتا، کوئی دنیوی غرض ایسے بے جوڑ عناصر کو جمع بھی کردے تو وہ صرف بکھرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں اور پھر کچھ بنانے کے بہ جائے آپس ہی میں کٹ مرتے ہیں۔ ایک مضبوط جماعت صرف اسی وقت وجود میں آتی ہے جب کہ اپنے خیالات میں مخلص اور اپنے مقصد سے محبت رکھنے والے لوگ باہم مجتمع ہوں اور پھر خیالات کا یہی اخلاص اور مقصد سے یہی محبت ان کے اندر آپس میں بھی اخلاص ومحبت پیدا کردے۔ اس طرح کی جماعت حقیقت میں ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوتی ہے، جس کے اندر فساد ڈالنے کے لیے شیطان کوئی شگاف نہیں پاتا اور باہر سے مخالفتوں کے سیلاب اٹھا اٹھا کر لاتا بھی ہے تو اسے اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔

باہمی مشاورت

دوسرا ضروری وصف یہ ہے کہ اس جماعت کو باہمی مشورے سے کام کرنا چاہیے اور آدابِ مشاورت کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔ خودسر لوگوں کی جماعت، جس میں ہر شخص اپنی من مانی کرے، حقیقت میں کوئی جماعت نہیں ہوتی، بلکہ محض ایک منڈلی ہوتی ہے، جس سے کوئی کام بھی بن نہیں آسکتا اور وہ جماعت بھی زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی، جس میں کوئی ایک شخص یا چند بااثر اشخاص کا ایک ٹولہ مختارِ کل بن جائے، باقی سب لوگوں کا کام اس کے اشاروں پر چلنا ہو۔ صحیح کام صرف مشاورت ہی سے ہوسکتا ہے کیوں کہ اس طرح نہ صرف یہ کہ بہت سے دماغ بحث و تمحیص سے ہر معاملے کے اچھے اور برے پہلوؤں کا جائزہ لے کر ایک بہتر نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ بلکہ اس سے دو فائدے اور بھی ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جس کام میں پوری جماعت کا مشورہ بالواسطہ یا بلاواسطہ شامل ہوا سے پوری جماعت اطمینانِ قلب کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کرتی ہے اور کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم پر ایک چیز اوپر سے ٹھونس دی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ اِس طریقے سے پوری جماعت کو معاملہ فہمی کی تربیت ملتی ہے۔ ہر فرد جماعت اور اس کے معاملات سے دل چسپی لیتا ہے اور اس کے فیصلوں میں اپنی ذمے داری محسوس کرتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مشاورت کے ساتھ آدابِ مشاورت کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ آدابِ مشاورت یہ ہیں کہ ہر شخص ایمان داری کے ساتھ اپنی رائے پیش کرے اور کوئی بات دل میں چھپا کر نہ رکھے۔ بحث میں ضد، ہٹ دھرمی اور کسی قسم کے تعصب کا دخل نہ ہو اور جب کثرتِ رائے سے ایک فیصلہ ہوجائے تو اختلاف رکھنے والے چاہے اپنی رائے نہ بدلیں، مگر جماعتی فیصلے کو پوری خوش دلی کے ساتھ عمل میں لانے کی کوشش کریں۔ یہ تین باتیں اگر نہ ہوں تو مشاورت کے تمام فوائد ضائع ہوجاتے ہیں، بلکہ یہی چیز آخرکار جماعت میں پھوٹ ڈال دیتی ہے۔

نظم وضبط

تیسرا اہم وصف ہے نظم وضبط، باضابطگی، باقاعدگی، باہمی تعاون اور ٹیم کی طرح کام کرنا۔ ایک جماعت اپنی تمام خوبیوں کے باوجود صرف اس وجہ سے ناکام ہوجاتی ہے کہ وہ اپنے فیصلوں اور منصوبوں کو عمل میں نہیں لاسکتی۔ اور یہ نتیجہ ہوتا ہے ضبط و نظم کی کمی اور تعاون کے فقدان کا۔ تخریبی کام محض ہلّڑ سے بھی انجام پاسکتے ہیں، مگر کوئی پائیدار تعمیری کام منظم سعی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

منظم سعی نام ہے اس چیز کا کہ جو ضابطہ تجویز کیا گیا ہو، پوری جماعت اس کی پابندی کرے۔ جماعت میں جس کو جس درجے میں بھی صاحب امر بنایا گیا ہو، اس کے احکام کی اطاعت کی جائے۔ جماعت کا ہر شخص فرض شناس ہو اور اپنے ذمہ کا کام ٹھیک وقت پر مستعدی کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کرے۔ جن کارکنوں کو جو کام مل کر کرنا ہو، وہ ایک دوسرے کے ساتھ پورا تعاون کریں۔ اور جماعت کی مشین اس قدر چست ہو کہ ایک فیصلہ ہوتے ہی اس کو عمل میں لانے کے لیے تمام پرزے حرکت میں آجائیں۔ دنیا میں اگر کوئی کام بنا سکتی ہیں تو ایسی ہی جماعتیں بنا سکتی ہیں۔ ورنہ ان جماعتوں کا عدم اور وجود برابر ہوتا ہے، جنھوں نے پرزے تو فراہم کر لیے ہوں مگر ان کے جوڑنے اور کس کر مشین کی طرح باقاعدہ چلانے کا کوئی انتظام نہ کیا ہو۔

تنقید بغرض اصلاح

آخری اور انتہائی اہم وصف یہ ہے کہ جماعت میں تنقید بغرض اصلاح کی روح بھی موجود ہو اور اس کا سلیقہ بھی پایا جاتا ہو۔ اندھے مقلدوں اور سادہ لوح معتقدوں کا گروہ خواہ کیسے ہی صحیح مقام سے کام کا آغاز کرے اور کیسے صحیح مقصد کو سامنے رکھ کر چلے، بہ ہر حال آخر کار بگڑتا چلا جاتا ہے۔ کیوں کہ انسانی کام میں کم زوریوں کا رونما ہونا فطرتاً ناگزیر ہے اور جہاں کم زوریوں پر نگاہ رکھنے والا کوئی نہ ہو، یا ان کی نشان دہی کرنا معیوب ہو، وہاں غفلت کی وجہ سے یا مجبورانہ سکوت کے باعث ہر کم زوری سکون و اطمینان کا آشیانہ پاتی چلی جاتی ہے اور انڈے بچے دینے لگتی ہے۔ جماعت کی صحت اور تندرستی کے لیے روحِ تنقید کے فقدان سے بڑھ کر کوئی چیز نقصان دہ نہیں، اور تنقیدی فکر کو دبانے سے بڑھ کر جماعت کے ساتھ کوئی اور بدخواہی نہیں ہو سکتی، یہی تو وہ چیز ہے، جس کے ذریعے سے خرابیاں بروقت سامنے آجاتی ہیں اور ان کی اصلاح کی سعی کی جا سکتی ہے۔ لیکن تنقید کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ وہ عیب چینی کی نیت سے نہ ہو بلکہ اخلاص کے ساتھ اصلاح کی نیت سے ہو۔ اور اس کے ساتھ دوسری اتنی ہی ضروری شرط یہ ہے کہ تنقید کرنے والوں کو تنقید کا سلیقہ آتا ہو۔ ایک نیک نیت ناقد بھی بے ڈھنگی، بے موقع اور بھونڈی تنقید سے جماعت کو وہی نقصان پہنچا سکتا ہے، جو ایک عیب چیں اور بدنیت مفسد کے ہاتھوں پہنچنا ممکن ہے۔

(۴)

تکمیلی اوصاف

اب تک یہ بتایا جاچکا ہے کہ معاشرے کی اصلاح اور اسلامی نظامِ زندگی کی تعمیر کا، جو کام اب درپیش ہے، اس کے لیے کن صفات کے حامل افراد درکار ہیں اور ان افراد کی اجتماعی تنظیم میں کن اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے۔

اس سلسلے میں اب تک جن امور کا ذکر کیا گیا ہے ان کی حیثیت دراصل محض ابتدائی اور بنیادی اوصاف کی ہے۔ جس طرح ایک کاروبار کی ابتدا کرنے کے لیے ایک کم سے کم سرمایہ دار درکار ہوتا ہے، جس کے بغیر اسے شروع ہی نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح اس کام کے لیے یہ کم سے کم اخلاقی سرمایہ ہے، جو آغازِ کار ہی میں موجود ہونا چاہیے، ورنہ اس کا حوصلہ کرنا ہی فضول ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے افراد کے ہاتھوں کسی اسلامی نظام کے قیام کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا، جو اسلام کو جانتے ہی نہ ہوں، یا اس کے بارے میں خود اپنے اندر ہی قلبی اطمینان اور ذہنی یک سوئی نہ رکھتے ہوں یا اس کو خود اپنے اخلاق و کردار اور اپنی عملی زندگی کا دین بنانے سے قاصر ہوں، یا اس کے قیام کی سعی کو انھوں نے اپنا مقصود ہی نہ ٹھہرایا ہو۔ اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر مطلوبہ اوصاف کے افراد جمع تو ہو جائیں، مگر ان کے دل باہم جڑے ہوئے نہ ہوں، ان میں تعاون اور نظم وضبط نہ ہو، ان کو مل کر کام کرنے کا ڈھنگ نہ آتا ہو اور وہ باہمی مشورہ وتنقید کے صحیح طریقوں سے نابلد ہوں، تو محض ان کا جمع ہو جانا کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں کرسکتا۔ لہٰذا یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ وہ چار انفرادی اور چار اجتماعی اوصاف، جن کا ذکر ہم نے اب تک کیا ہے۔ درحقیقت اس کام کا سرمایۂ آغاز ہیں اور ان کی جو کچھ بھی اہمیت ہے اسی لحاظ سے ہے۔ لیکن یہ خیال کرنا صحیح نہیں

ہے کہ اس کام کے فروغ اور اس کی کامیابی کے لیے بس یہی اخلاقی اور رُوحانی سرمایہ کافی ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ مزید اوصاف کون سے ہیں، جو اصلاح و تعمیر کے مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہیں۔

تعلق باللہ اور خلوص

ان میں اوّلین وصف تعلق باللہ اور اخلاص للہ ہے۔ دنیا کے دوسرے کام تو نفس یا خاندان یا قبیلے یا قوم و وطن کی خاطر کیے جاسکتے ہیں، ذاتی اغراض اور مادّی مقاصد کی ساری آلائشوں کے ساتھ کیے جاسکتے ہیں، خدا پرستی ہی نہیں، انکارِ خدا تک کے ساتھ کیے جاسکتے ہیں، اور ان میں ہر طرح کی دنیاوی کامیابیاں ممکن ہیں۔ لیکن اسلامی نظامِ زندگی کا برپا کرنا ایک ایسا کام ہے، جس میں کوئی کامیابی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک آدمی کا تعلق اللہ کے ساتھ صحیح، مضبوط اور گہرا نہ ہو، اور اس کی نیت خالصتاً اللہ ہی کے لیے کام کرنے کی نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جس چیز کو آدمی قائم کرنا چاہتا ہے وہ اللہ کا دین ہے اور اسے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی سب کچھ اس خدا کے لیے کرے جس کا یہ دین ہے۔ اسی کی رضا اس کام میں مطلوب ہونی چاہیے، اسی کی محبت اس کے لیے واحد محرک ہونی چاہیے۔ اسی کی تائید و نصرت پر کلّی اعتماد ہونا چاہیے۔ اسی سے اجر کی ساری امیدیں وابستہ ہونی چاہئیں۔ اسی کی ہدایات اور اسی کے امر و نہی کا اتباع ہونا چاہیے اور اسی کی پکڑ کا خوف دل پر چھایا رہنا چاہیے۔ اس کے سوا جس خوف، جس لالچ اور جس محبت اور جس اتباع و اطاعت کی آمیزش بھی ہوگی اور جو دوسری غرض بھی اس کام میں شامل ہوجائے گی وہ راہِ راست سے قدم ہٹا دے گی اور اس کے نتیجے میں اور جو کچھ بھی قائم ہوجائے بہ ہر حال اللہ کا دین قائم نہ ہوسکے گا۔

فکرِ آخرت

اسی سے قریب تر تعلق رکھنے والا دوسرا وصف فکرِ آخرت ہے۔ مومن کے کام کرنے کی جگہ اگرچہ دنیا ہے اور جو کچھ اسے کرنا ہے یہیں کرنا ہے، مگر وہ کام اس دنیا کے لیے نہیں کرتا بلکہ آخرت کے لیے کرتا ہے اور اس کا مطمحِ نظر دنیاوی نتائج نہیں بلکہ اُخروی نتائج ہوتے ہیں۔

اسے ہر لحاظ سے وہ کام کرنا چاہیے، جو آخرت میں نافع ہے اور ہر اس مشغلے سے دست کش ہو جانا چاہیے، جس کا وہاں کوئی حاصل نہیں نکلنا ہے۔ اُسے ہر اس فائدے کو ٹھکرا دینا چاہیے، جو آخرت میں نقصان کا موجب ہو اور ہر اس نقصان کو انگیز کر لینا چاہیے، جو آخرت میں نفع بخش ہو، اسے فکر صرف آخرت کے عذاب و ثواب کی ہونی چاہیے۔ دنیا کے کسی عذاب و ثواب کی کوئی اہمیت اس کی نگاہ میں نہ ہونی چاہیے۔ اس کی کوششیں اس دنیا میں بار آور ہوں یا نہ ہوں، یہاں اس کی کامیابی ہوتی نظر آئے یا ناکامی، یہاں اس کی تعریف ہو یا ندامت، یہاں وہ انعام پائے یا آزمائشوں میں ڈالا جائے ہر حال میں اس کو اِس یقین کے ساتھ کام کرنا چاہیے، جس خدا کے لیے وہ یہ ساری محنتیں کر رہا ہے، اس کی نگاہ سے کچھ پوشیدہ نہیں ہے، اور اس کے ہاں دارِ آخرت کی ابدی جزا سے وہ ہرگز محروم نہ رہے گا، اور وہیں کی کامیابی اصلی کامیابی ہے۔ اِس ذہنیت کے بغیر آدمی کے لیے چند قدم بھی اِس راہ میں صحیح رُخ پر چلنا ممکن نہیں ہے۔ دنیا کی مقصودیت کا لگاؤ کسی ادنیٰ درجے میں بھی اس کے ساتھ لگا رہ جائے تو وہ قدم میں لغزش پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ راہِ خدا میں ایک چوٹ تو نہیں دو چار چوٹیں آخر کار اس شخص کی ہمتیں توڑ دیتی ہیں، جو دنیوی کامیابیوں کو مقصود بنا کر چلتا ہے اور اس راہ کی کوئی کامیابی کسی نہ کسی مرحلے پر اس آدمی کے رویّے میں بگاڑ پیدا کر دیتی ہے، جس کے دل کو دنیوی مقاصد کی کوئی چاٹ لگی ہوئی ہو۔

حسنِ سیرت

ان دو اوصاف کی تاثیر کو، جو چیز عملاً ایک زبردست قوتِ تسخیر میں تبدیل کر دیتی ہے وہ حسنِ سیرت ہے۔ خدا کی راہ میں کام کرنے والے لوگوں کو عالی ظرف اور فراخ حوصلہ ہونا چاہیے۔ ہم درد خلائق اور خیر خواہِ انسانیت ہونا چاہیے اور کریم النفس اور شریف الطبع ہونا چاہیے، خوددار اور خوگرِ قناعت ہونا چاہیے۔ متواضع اور منکسر المزاج ہونا چاہیے۔ شیریں کلام اور نرم خو ہونا چاہیے۔ وہ ایسے لوگ ہونے چاہئیں، جن سے کسی کو شر کا اندیشہ نہ ہو اور ہر ایک ان سے خیر خواہی کا متوقع ہو، جو اپنے حق سے کم پر راضی ہوں اور دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دینے پر تیار ہوں، جو برائی کا جواب بھلائی سے دیں یا کم سے کم برائی سے نہ دیں۔ جو اپنے عیوب کے معترف اور دوسروں کی بھلائیوں کے قدر دان ہوں، جو اتنا بڑا دل رکھتے ہوں کہ لوگوں کی کمزوریوں سے چشم پوشی

کرسکیں، قصوروں کو معاف کرسکیں، زیادتیوں سے درگزر کرسکیں، اور اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہ لیں۔ جو خدمت لے کر نہیں، خدمت کر کے خوش ہوتے ہوں، اپنی غرض کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کی بھلائی کے لیے کام کریں، ہر تعریف سے بے نیاز اور ہر مذمت سے بے پرواہ ہو کر وہ اپنا فرض انجام دیں اور خدا کے سوا کسی کے اجر پر نگاہ نہ رکھیں، جو طاقت سے دبائے نہ جاسکیں، دولت سے خریدے نہ جاسکیں، مگر حق اور راستی کے آگے بے تامّل سر جھکا دیں، جن کے دشمن بھی ان پر بھروسا رکھتے ہوں کہ کسی حال میں ان سے شرافت اور انصاف کے خلاف کوئی حرکت سرزد نہیں ہوسکتی۔ یہ دلوں کو موہ لینے والے اخلاق ہیں۔ ان کی کاٹ تلوار کی کاٹ سے بڑھ کر اور ان کا سرمایہ سیم و زر کی دولت سے گراں تر ہے۔ کسی فرد کو یہ اخلاق میسر ہوں تو وہ اپنے گرد و پیش کی آبادی کو مسخّر کرلیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی جماعت کی جماعت ان اوصاف سے متصف ہو، اور پھر وہ کسی مقصدِ عظیم کے لیے منظّم سعی بھی کر رہی ہو تو ملک کے ملک اس کے آگے مسخّر ہوتے چلے جاتے ہیں، حتیٰ کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو شکست دینے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

صبر و استقامت

اس کے ساتھ ایک اور صفت بھی ہے، جسے کامیابی کی کلید کہنا چاہیے، اور وہ ہے صبر، یہ ایک وسیع لفظ ہے، جس کے بہت سے مفہومات ہیں اور راہِ خدا میں کام کرنے والوں کو ان میں سے ہر مفہوم کے لحاظ سے صابر ہونا چاہیے۔

صبر کا ایک مفہوم یہ ہے کہ آدمی جلد باز نہ ہو، اپنی کوششوں کے نتائج فوراً اور جلدی دیکھنے کے لیے بے تاب نہ ہو اور دیر لگتے دیکھ کر ہمت نہ ہار جائے۔ صابر آدمی کی خوبی یہ ہے کہ وہ تمام عمر ایک مقصد کے پیچھے مسلسل محنت کیے چلا جاتا ہے، اور پیہم ناکامیوں کے باوجود اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ اصلاحِ خلق اور تعمیرِ حیات کا کام ایسا صبر آزما ہے کہ اس صفت کے بغیر کوئی شخص اس سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ یہ بہ ہر حال ہتھیلی پر سرسوں جمانا نہیں ہے۔

صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آدمی تلوّن مزاجی، ضعفِ رائے اور قلتِ عزم کی بیماری میں مبتلا نہ ہو۔ اس میں یہ صفت موجود ہو کہ جس راہ کو اس نے سوچ سمجھ کر اختیار کرلیا ہے اس پر ثابت قدم رہے اور دل کے پورے عزم و ارادے کی پوری قوت کے ساتھ اس پر بڑھتا چلا جائے۔

صبر ہی کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ آدمی مشکلات اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور اپنے مقصد کی راہ میں جو تکلیف بھی پیش آجائے اسے ٹھنڈے دل کے ساتھ برداشت کرلے۔ صابر آدمی کسی طوفان اور کسی سیلاب کے تھپیڑوں سے شکست خوردہ ہو کر منہ نہیں موڑتا۔

صبر کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ آدمی زود رنج اور مشتعل مزاج نہ ہو۔ بلکہ متحمل اور بردبار ہو، جس شخص کو اصلاح و تعمیر کا کام کرنا ہو اور جسے تعمیر کے لیے کچھ نہ کچھ ناگزیر تخریب بھی کرنی پڑے، خصوصیت کے ساتھ جب یہ خدمت ایسے حالات کی بگڑی ہوئی سوسائٹی میں انجام دینی ہو اسے لامحالہ بڑی گندی اور گھناؤنی اور کمینہ قسم کی مخالفتوں سے سابقہ پیش آکر رہتا ہے۔ اگر وہ اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ گالیاں کھا کر ہنس دے، طعنے سن کر ٹال دے، الزام اور بہتان اور جھوٹے پروپیگنڈے کو یکسر نظر انداز کر کے پورے سکون اور جمعیت خاطر کے ساتھ اپنا کام کرتا رہے تو بہتر یہی ہے کہ وہ اس راہ میں قدم ہی نہ رکھے۔ اس لیے کہ یہ کانٹوں بھری راہ ہے، اس کا ہر کانٹا یہ عزم کیے بیٹھا ہے کہ آدمی جس طرف بھی چاہے چلا جائے، مگر اس سمت میں اسے ایک انچ بھی نہ بڑھنے دیا جائے گا۔ اس حالت میں جو شخص ہر کانٹے سے الجھنے لگے، وہ کیا پیش قدمی کرے گا۔ یہاں تو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے، جن کے دامن سے اگر کوئی کانٹا الجھ جائے تو وہ دامن کا وہ حصہ پھاڑ کر اس کے حوالے کر دیں اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنی راہ کھوٹی نہ کریں۔ یہ صبر صرف مخالفوں ہی کے مقابلے میں درکار نہیں ہے بلکہ بسا اوقات اس راہ کے راہرو کو، خود اپنے ساتھیوں سے تلخ اور ناگوار باتوں سے سابقہ پیش آجاتا ہے اور ان کے معاملے میں اگر وہ حلم و تحمل سے کام نہ لے تو پورے قافلے کی راہ مار سکتا ہے۔

صبر اس چیز کا نام بھی ہے کہ آدمی ہر خوف اور ہر لالچ کے مقابلے میں راہِ راست پر جما رہے، شیطان کی ساری ترغیبات اور نفس کی تمام خواہشات کے علی الرغم اپنا فرض بجالائے۔ حرام سے پرہیز کرے اور حدود اللہ پر قائم رہے۔ گناہ کی ساری لذتوں اور منفعتوں کو ٹھکرا دے اور نیکی اور راستی کے ہر نقصان اور اس کی بہ دولت حاصل ہونے والی ہر محرومی کو انگیز کر جائے۔ اپنی آنکھوں سے دنیا پرستوں کی رونقِ حیات دیکھے اور اس پر ریجھنا تو درکنار، دل میں ادنیٰ سی حسرت کو بھی راہ نہ دے۔ اپنے سامنے دنیا طلبی کی راہیں کشادہ اور کامرانیوں کے مواقع موجود پائے اور دل کی پوری طمانیت کے ساتھ اس متاعِ حیات پر راضی رہے، جو اپنے مقصد کی خدمت کرتے ہوئے وہ اپنے رب کے فضل سے حاصل کر رہا ہو۔

صبر ان تمام معنوں میں کلیدِ کامیابی ہے، جس پہلو سے بھی ہمارے کام میں بے صبری کا دخل ہوگا، اس کا برا نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا۔

حکمت

ان سب اوصاف کے ساتھ ایک نہایت اہم وصف حکمت ہے، جس پر بہت بڑی حد تک کامیابی کا انحصار ہے۔ دنیا میں جو نظامِ زندگی بھی قائم ہیں ان کو اعلیٰ درجے کے ذہین اور ہوشیار لوگ چلا رہے ہیں اور ان کی پشت پر مادی وسائل کے ساتھ عقلی و فکری طاقتیں اور علمی و فنی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ ان کے مقابلے میں ایک دوسرے نظام کو قائم کر دینا اور کامیابی کے ساتھ چلا لینا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ بسم اللہ کے گنبد میں رہنے والوں کے کرنے کا کام نہیں ہے۔ سادہ لوح لوگ خواہ کتنے ہی نیک اور نیک نیت ہوں، اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے گہری بصیرت اور تدبّر کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے دانش مندی اور معاملہ فہمی درکار ہے۔ اس کام کو وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو موقع شناس اور با تدبیر ہوں اور ان کی زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ 'حکمت' ان سب اوصاف کے لیے ایک جامع لفظ ہے اور اس کا اطلاق دانائی وزیرکی کے متعدد مظاہر پر ہوتا ہے۔

یہ حکمت ہے کہ آدمی انسانی نفسیات کی سمجھ رکھتا ہو اور انسانوں سے معاملہ کرنا جانتا ہو۔ لوگوں کے اذہان کو اپنی دعوت سے متاثر کرنے اور ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کے طریقوں سے واقف ہو۔ ہر شخص کو ایک ہی لگی بندھی دوا دیتا نہ چلا جائے بلکہ ہر ایک کے مزاج اور مرض کی صحیح تشخیص کر کے علاج کرے۔ سب کو ایک لکڑی سے نہ ہانکے بلکہ جن جن اشخاص اور طبقوں اور گروہوں سے اس کو سابقہ پیش آئے ان کے مخصوص حالات کو سمجھ کر ان کے ساتھ معاملہ کرے۔

یہ بھی حکمت ہے کہ آدمی اپنے کام کو اور اس کے کرنے کے طریقوں کو جانتا ہو اور اس کے راستے میں پیش آنے والی دشواریوں، مخالفتوں اور مزاحمتوں سے نمٹنا بھی اس کو آتا ہو۔ اسے ٹھیک ٹھیک معلوم ہونا چاہیے کہ جس مقصد کے لیے وہ سعی کرنے اٹھا ہے اس کے لیے اسے کیا کچھ کرنا ہے، کس کس قسم کی رکاوٹوں کو دور کرنا ہے۔

یہ بھی حکمت ہی ہے کہ آدمی وقت کے حالات پر نظر رکھتا ہو، مواقع کو سمجھتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ کس موقع پر کیا تدبیر کی جانی چاہیے۔ حالات کو سمجھے بغیر اندھا دھند قدم اٹھا دینا، بے موقع

کام کرنا اور موقعے پر چوک جانا مغفل لوگوں کا کام ہے اور ایسے لوگ خواہ کتنے ہی پاکیزہ مقصد کے لیے کتنی ہی نیکی اور نیک نیتی کے ساتھ کام کر رہے ہوں، کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اور ان سب حکمتوں سے بڑھ کر اس الحکمت یہ ہے کہ آدمی دین میں تفقہ اور معاملاتِ دنیا میں بصیرت رکھتا ہو۔ محض احکام اور مسائلِ شریعت سے واقف ہونا اور انھیں پیش آمدہ حوادث پر چسپاں کر دینا منصبِ افتاء کے لیے تو کافی ہو سکتا ہے۔ مگر بگڑے ہوئے معاشرے کو درست کرنے اور نظامِ زندگی کو جاہلیت کی بنیادوں سے اکھاڑ کر از سرِ نو قائم کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کے لیے تو ضروری ہے کہ آدمی جزیاتِ احکام کے ساتھ کلّیاتِ احکام، بلکہ پورے نظامِ دین پر نظر رکھتا ہو، پھر احکام کے ساتھ ان کی حکمت کا بھی اسے علم ہو اور وقت کے ان حالات و مسائل کو بھی وہ سمجھتا ہو، جن میں احکام کو رائج کرنا مطلوب ہو۔

مطلوبہ اوصاف کے اس مرقع کو دیکھ کر بادی النظر میں ایک آدمی ہول کھا جاتا ہے اور یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ یہ کام تو پھر کاملین کے کرنے کا ہے۔ عام انسان کہاں سے اتنے وصف لے کر آ سکتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہر صفت کا ہر شخص میں بہ درجہ کمال پایا جانا لازم نہیں ہے۔ اور نہ یہی لازم ہے کہ کسی میں وہ پہلے ہی قدم پر اپنی پوری تربیت یافتہ شکل میں موجود ہو۔ ہمارا مقصود ان باتوں کے بیان کرنے سے صرف یہ بات ذہن نشین کرنا ہے کہ جو لوگ اس کام کو کرنے کے لیے اٹھیں وہ محض ''خدمتِ قوم کا ایک کام'' سمجھ کر یونہی کھڑے نہ ہو جائیں بلکہ اپنے نفس کا جائزہ لے کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس کام کے لیے جو اوصاف مطلوب ہیں ان کا مادہ ان کے اندر موجود ہے یا نہیں۔ بس مادہ اگر موجود ہے تو آغازِ کار کے لیے کافی ہے۔ اس کو پرورش کرنا اور اپنی استعداد کے مطابق زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک ترقی دینا بعد کے مراحل سے تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح ایک ذرا سا بیج زمین میں جڑ پکڑنے کے بعد، آہستہ آہستہ غذا پا کر تناور درخت بن جاتا ہے۔ لیکن بیج ہی موجود نہ ہو تو کچھ بھی نہیں بن سکتا۔ اسی طرح صفاتِ مطلوبہ کا مادّہ آدمی میں موجود نہ ہو تو مناسب سعی و کوشش سے وہ بہ تدریج کمال تک پہنچ سکتا ہے۔ مگر سرے سے مادہ موجود ہی نہ ہو تو کسی سعی اور تربیت سے اس کا پیدا ہو جانا ممکن نہیں ہے۔

جو کچھ اب تک کہا جا چکا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اصلاح و تعمیر کے لیے ایک صحیح

لائحہ عمل جتنا ضروری ہے اس سے بہت زیادہ ضروری ایسے کارکنوں کا وجود ہے، جو اس کام کے لیے موزوں اخلاقی اوصاف رکھتے ہوں کیوں کہ آخر کار جس چیز کو معاشرے سے نبرد آزما اور اقامتِ دین کی آزمائشوں سے دو چار ہونا ہے وہ کسی لائحہ عمل کی دفعات نہیں بلکہ ان لوگوں کی اجتماعی وانفرادی سیرت ہے، جو میدانِ عمل میں کام کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔ اس لیے ہمیں کسی لائحہ عمل اور پروگرام کو طے کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کام کے لیے کیسے کارکن درکار ہیں۔ ان کو کن اوصاف سے متصف اور کن برائیوں سے پاک ہونا چاہیے اور ایسے کارکنوں کی تیاری کے ذرائع کیا ہیں۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے بعد ہم نے اوصافِ مطلوبہ کو تین حصوں میں بیان کیا ہے۔

اوّلاً وہ اوصاف، جو بنیادِ کار کی حیثیت سے اس کام میں حصہ لینے والے ہر فرد کے اندر موجود ہونی چاہئیں اور وہ یہ ہیں (۱) دین کا صحیح فہم (۲) اس پر پختہ ایمان (۳) اس کے مطابق سیرت و کردار اور (۴) اس کی اقامت کو مقصدِ زندگی بنانا۔ ثانیاً وہ اوصاف ہیں، جو اس خدمت کے لیے اٹھنے والی جماعت میں پائے جانے چاہئیں اور وہ یہ ہیں (۱) باہمی محبت، حسنِ ظن، اخلاص، ہم دردی و خیر خواہی اور ایک دوسرے کے لیے ایثار (۲) آپس کے مشورے سے کام کرنا اور مشاورت کے اسلامی آداب کو ملحوظ رکھنا (۳) نظم وضبط و باقاعدگی، تعاون اور ٹیم اسپرٹ۔ تنقید بغرضِ اصلاح، جو سلیقے اور معقول طریقے سے ہو، جس سے جماعت کے اندر رونما ہونے والی خامیوں کا ہر وقت تدارک ہو سکے، نہ کہ خرابیوں میں اُلٹا اضافہ ہو۔

ثالثاً وہ اوصاف، جو اقامتِ دین کی جدوجہد کو صحیح خطوط پر چلانے اور کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے ناگزیر ہیں۔ یعنی (۱) اللہ کے ساتھ گہرا تعلق اور اسی کی رضا کے لیے کام کرنا (۲) آخرت کی باز پرس کو یاد رکھنا اور اجرِ آخرت کے سوا کسی دوسری چیز پر نگاہ نہ رکھنا (۳) حسنِ اخلاق (۴) صبر (۵) حکمت۔

اب ہمیں یہ دکھانا ہے کہ وہ بڑی بڑی برائیاں کیا ہیں، جن سے اس مقصدِ عظیم کے خادموں کو پاک ہونا چاہیے۔

(۵)

بنیادی عیوب

کبر و غُرور

اولین اور بدترین عیب، جو ہر بھلائی کی جڑ کاٹ دیتا ہے کبر و تفاخر، غرور، خود پسندی اور تعلّی ہے۔ یہ ایک سراسر شیطانی جذبہ ہے، جو شیطانی کاموں کے لیے ہی موزوں ہوسکتا ہے۔ خیر کا کوئی کام اس کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ بڑائی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ بندوں میں بڑائی کا گھمنڈ ایک جھوٹ کے سوا کچھ نہیں۔ جو شخص یا گروہ اس جھوٹے پندار میں مبتلا ہو وہ اللہ تعالیٰ کی ہر تائید سے محروم ہوجاتا ہے کیوں کہ اللہ کو سب سے بڑھ کر یہی چیز اپنی مخلوق میں ناپسند ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مرض کے مریض کو کبھی راہ راست کی طرف ہدایت نہیں ملتی۔ وہ پے در پے جہالتوں اور حماقتوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار ناکامی کا منہ دیکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ خلقِ خدا کے ساتھ برتاؤ میں اس سے تکبّر کا جتنا جتنا اظہار ہوتا جاتا ہے اتنی ہی اس کے خلاف نفرت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ مبغوضِ خلائق ہوکر وہ اس قابل ہی نہیں رہتا کہ اس کا کوئی اخلاقی اثر لوگوں میں قائم ہوسکے۔

خیر کے لیے کام کرنے والوں میں یہ بیماری کئی راہوں سے آتی ہے۔ کم ظرف لوگوں میں یہ اس راہ سے آتی ہے کہ جب ان کی دینی و اخلاقی حالت گرد و پیش کے معاشرے کی بہ نسبت کسی حد تک بہتر ہوجاتی ہے اور کچھ قابلِ قدر خدمات بھی وہ بجالاتے ہیں، جن کا اعتراف دوسروں کی زبانوں سے ہونے لگتا ہے تو شیطان ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالنا شروع کردیتا ہے کہ اب تم واقعی بڑی چیز ہوگئے ہو اور شیطان ہی کی اکساہٹ سے وہ اپنی زبان اور اپنے طرزِ عمل سے جتانے پر اتر آتے ہیں۔ اس طرح وہ کام جس کا آغاز نیکی کے جذبے سے ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ ایک نہایت ہی غلط راہ پر چل پڑتا ہے۔ دوسرا راستہ اس کے آنے کا یہ ہے کہ جو لوگ نیک نیتی کے

ساتھ ایک طرف اپنی اور دوسری طرف خلقِ خدا کی اصلاح کے لیے کوشش کرتے ہیں ان کے اندر لامحالہ کچھ بھلائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کسی نہ کسی حد تک اپنے معاشرے کی عام حالت سے ممتاز ہوتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ ان کی خدمات قابلِ قدر ہوتی ہیں اور یہ ایسے واقعی امور ہیں، جو بہ ہر حال محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ یہ امر واقعہ کا احساس بہ جائے خود فطری اور ناگزیر ہے، مگر نفس کی ایک ذرا سی اُکساہٹ اسے تکبّر اور خود پسندی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھر بسا اوقات ایسی صورتیں پیش آتی ہیں کہ جب ان کے مخالفین ان کے کام اور کام سے گزر کر ان کی ذات میں کیڑے ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں تو انھیں مجبوراً اپنی مدافعت میں چند باتیں کہنی پڑتی ہیں، جو چاہے بیان واقعی ہوں مگر اپنے محاسن کے اظہار سے خالی نہیں ہوتیں۔ اس چیز کو ایک ذرا سی بے اعتدالی جائز حد سے بڑھا کر تفاخر کے حدود میں پہنچا دیتی ہے۔ یہ ایک خطرناک چیز ہے۔

احساسِ بندگی

جس سے ہر فرد اور جماعت کو خبردار رہنا چاہیے۔ جو خلوص کے ساتھ اصلاح کا مقصد لے کر اُٹھے۔ بلکہ ایسے ہر شخص میں فرداً فرداً اور ایسی ہر جماعت میں مجتمعاً عبدیت کا احساس نہ صرف موجود بلکہ زندہ اور تازہ رہنا چاہیے۔ اسے کبھی یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ کبریائی صرف خدا کی ذات کے لیے مخصوص ہے۔ بندے کا مقام عجز و نیاز کے سوا اور کچھ نہیں۔ کسی بندے میں اگر فی الواقع کوئی بھلائی پیدا ہو تو یہ اللہ کا فضل ہے۔ فخر کا نہیں، شکر کا مقام ہے اس پر اللہ کے حضور اور زیادہ عاجزی پیش کرنی چاہیے اور اس تھوڑی سی پونجی کو خیر کی خدمت میں لگا دینا چاہیے تاکہ اللہ مزید فضل سے نوازے اور یہ پونجی ترقی کرے۔ بھلائی پا کر غرورِ نفس میں مبتلا ہونا تو دراصل اسے برائی سے بدل لینا چاہے اور یہ ترقی کا نہیں بلکہ تنزّل کا راستہ ہے۔

محاسبۂ نفس

احساس بندگی کے بعد دوسری چیز، جو انسان کو تکبّر کے رجحانات سے بچا سکتی ہے وہ محاسبۂ نفس ہے۔ جو شخص اپنا ٹھیک ٹھیک حساب لگائے اور اپنی خوبیوں کو محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھے کہ وہ کن کمزوریوں اور خامیوں اور کوتاہیوں میں مبتلا ہے، وہ کبھی خود پسندی و خود پرستی کے مرض کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اپنے گناہوں اور قصوروں پر کسی کی نگاہ ہو تو استغفار سے اس کو اتنی فرصت ہی نہ ملے کہ استکبار کی ہوا اس کے سر میں سما سکے۔

اعلیٰ افراد پر نظر

اس غلط رجحان کو روکنے والی ایک اور چیز یہ ہے کہ آدمی صرف ان پستیوں کی طرف نہ دیکھے، جن سے وہ اپنے آپ کو بلند پاتا ہے۔ بلکہ دین و اخلاق کی ان بلندیوں کو بھی دیکھے، جن کے مقابلے میں وہ ابھی بہت پست ہے۔ اخلاق و رُوحانیت کی پستیاں بھی لامتناہی ہیں اور بلندیاں بھی۔ برے سے برا آدمی بھی نیچے کی طرف دیکھے تو کسی اور کو اپنے سے بدتر پا کر اپنی برتری پر فخر کرسکتا ہے مگر اس فخر کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی موجودہ حالت پر مطمئن ہوکر بہتر بننے کی کوشش چھوڑ دیتا ہے بلکہ اس سے گزر کر نفس کی شیطنیت اسے یہ اطمینان بھی دلاتی ہے کہ کچھ اور زیادہ نیچے اتر جانے کی بھی ابھی گنجائش ہے۔ یہ نقطۂ نظر صرف وہی لوگ اختیار کرسکتے ہیں، جو اپنی ترقی کے دشمن ہوں۔ ترقی کی سچی طلب رکھنے والے ہمیشہ نیچے دیکھنے کی بہ جائے اوپر دیکھتے ہیں۔ ہر بلندی پر پہنچ کر مزید بلندیاں ان کے سامنے آتی ہیں، جنھیں دیکھ کر فخر کے بہ جائے اپنی پستی کا احساس ان کے دل میں خلش پیدا کرتا ہے اور یہی خلش انھیں اور زیادہ اوپر چڑھنے پر آمادہ کرتی ہے۔

ان سب چیزوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جماعت ہر وقت اس معاملے میں چوکنی رہے۔ اور اپنے دائرے میں کبر اور تعلّی اور فخر و غرور کے ہر ظہور کا نوٹس لے کر بروقت اس کا تدارک کرے۔ مگر تدارک کی یہ کوشش کبھی ایسے طریقوں سے نہ ہونی چاہیے کہ لوگوں میں بناوٹی انکسار اور نمائشی تواضع کی بیماری پیدا ہوجائے۔ کبر کی اس سے بدتر کوئی قسم نہیں، جس پر تصنّع کے ساتھ عجز و انکسار کا پردہ ڈالا گیا ہو۔

نمود و نمائش

دوسرا بڑا عیب، جو خیر کی جڑوں کو کھا جانے میں کبر سے کسی طرح کم نہیں، یہ ہے کہ کوئی شخص بھلائی کا کام نمود و نمائش کے لیے کرے اور اس کام میں اسے خلق کی تحسین حاصل کرنے کی فکر یا اس کی پروا ہو۔ یہ چیز صرف خلوص ہی کی نہیں حقیقت میں ایمان کی بھی ضد ہے۔ اور اسی بنا پر اسے چھپا ہوا شرک قرار دیا گیا ہے۔ خدا اور آخرت پر ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان صرف خدا کی رضا کے لیے کام کرے۔ اسی سے اجر کی آس لگائے اور دنیا کے بہ جائے آخرت کے نتائج پر نگاہ رکھے، لیکن ریاکار انسان خلق کی رضا کو مقصود بناتا ہے۔ خلق ہی کے اجر کا

طالب ہوتا ہے اور دنیا ہی میں اپنا اجر نام ونمود، شہرت، ہر دل عزیزی، نفوذ واثر اور حشمت وجاہ کی شکل میں پالینا چاہتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے خلقِ خدا کو شریک بنایا، یا اس کا مدِ مقابل بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں آدمی خدا کے دین کی خواہ کتنی اور کیسی ہی خدمت کرے۔ بہ ہر حال وہ نہ خدا کے لیے ہوگی، نہ اس کے دین کی خاطر ہوگی اور نہ اس کا شمار خدا کے ہاں نیکیوں میں ہوگا۔

صرف یہی نہیں کہ یہ ناپاک جذبہ نتیجے کے اعتبار سے عمل کو ضائع کر دیتا ہے، بلکہ درحقیقت اس کے ساتھ کوئی صحیح عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس جذبے کی فطری خاصیت یہ ہے کہ آدمی کو اس کام سے زیادہ کام کے اشتہار کی فکر ہوتی ہے اور اسی کو وہ کام سمجھتا ہے، جس کا ڈھنڈورہ دنیا میں پٹے اور تحسین وآفرین کا خراج وصول کر کے لائے۔ خاموش کام جس کا خدا کے سوا کسی کو پتہ نہ ہو، اس کے نزدیک کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس طرح آدمی کے عمل کا دائرہ صرف قابلِ اشتہار اعمال تک محدود ہو جاتا ہے اور اشتہار کا مقصود حاصل ہو جانے کے بعد خود ان کے اعمال کے ساتھ بھی اسے کوئی دل چسپی باقی نہیں رہتی۔ آغاز کار میں خواہ کتنے ہی خلوص کے ساتھ عملی زندگی کی ابتدا کی گئی ہو یہ بیماری لگتے ہی خلوص اس طرح غائب ہونا شروع ہو جاتا ہے، جیسے دق کی بیماری آدمی کی قوتِ حیات کو کھاتی چلی جاتی ہے۔ پھر اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ منظرِ عام سے ہٹ کر بھی نیک رہے اور اپنا فرض سمجھ کر بھی کوئی فرض بجالائے۔ وہ ہر چیز کو اس کی نمائشی قدر اور تحسینِ خلق کی قیمت کے لحاظ سے جانچتا ہے۔ ہر معاملے میں صرف یہ دیکھتا ہے کہ دنیا کس روش کو پسند کرتی ہے اور کسی ایسے کام کا تصوّر کرنا بھی اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے، جو دنیا میں اسے غیر مقبول بنا دے۔ خواہ ایمان داری کے ساتھ اس کے ضمیر کی آواز یہی ہو کہ وہ ہے کرنے کا کام۔

گوشوں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والوں کے لیے اس فتنے سے بچنا نسبتاً بہت آسان ہے۔ مگر جو لوگ پبلک میں آکر اصلاح اور خدمت اور تعمیر کے کام کریں، وہ ہر وقت اس خطرے میں مبتلا رہتے ہیں کہ نہ معلوم کب اس اخلاقی دق کے جراثیم ان کے اندر نفوذ کر جائیں۔ انھیں بہ ہر حال بہت سے وہ کام کرنے ہوتے ہیں، جو منظرِ عام پر آتے ہیں، انھیں عوام الناس کو اپنا ہم نوا بنانے اور ان کے اندر نفوذ حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہوتی ہے۔ ان کے کام کی بہت سی ضروریات اس بات پر بھی مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنے کاموں کی رُوداد یں شائع کریں۔ ان کی کچھ نہ کچھ خدمات ایسی بھی ہوتی ہیں، جو ان کی طرف خلق کا رجوع بڑھاتی اور زبانوں سے ان کے لیے

تحسین کے کلمات نکلواتی ہیں۔ انھیں مخالفتوں سے بھی سابقہ پیش آتا ہے اور اپنی مخالفت میں بادلِ ناخواستہ ہی سہی، انھیں مجبوراً اپنے اچھے پہلوؤں کو نمایاں کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کہ شہرت ہو، مگر شہرت کی چاٹ نہ لگے۔ نمود و نمائش ہو مگر نمود و نمائش کی خاطر کام کرنے کی بیماری نہ لگے۔ مقبولیت ہو مگر وہ مقصود نہ بننے پائے، تحسینِ خلق ہو مگر اس کے حصول کی فکر یا اس کی پروانہ ہو، ریا کی پیدائش کے اسباب چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوں مگر ریا سے دامن بچا رہے۔ اس کے لیے بڑی کاوش، بڑی توجہ اور بڑی محنت کی ضرورت ہے۔ ایک ذرا سا تساہل بھی اس معاملے میں ریاکاری کے جراثیم کو گھس آنے کا راستہ دے سکتا ہے۔

انفرادی کوشش

اس سے بچنے کے لیے انفرادی کوشش بھی ہونی چاہیے اور اجتماعی کوشش بھی۔ انفرادی کوشش کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ ایسے نیک اعمال کا التزام کرے، جو زیادہ سے زیادہ اخفا کے ساتھ ہوں اور ہمیشہ اپنے نفس کا جائزہ لے کر دیکھتا رہے کہ اسے زیادہ دل چسپی ان مخفی نیکیوں میں محسوس ہوتی ہے یا ان نیکیوں میں جو منظرِ عام پر آنے والی ہوں۔ اگر دوسری صورت ہو تو آدمی کو فوراً خبردار ہو جانا چاہیے کہ ریا اس کے اندر نفوذ کر رہا ہے اور اللہ سے پناہ مانگتے ہوئے پوری قوتِ ارادی کے ساتھ نفس کی اس کیفیت کو بدلنے کی سعی کرنی چاہیے۔

اجتماعی کوشش

اجتماعی کوشش کی صورت یہ ہے کہ جماعت اپنے دائرے میں ریاکارانہ رُجحانات کو کبھی نہ پنپنے دے۔ اپنے کاموں میں اظہار و اعلان کو بس حقیقی ضرورت تک محدود رکھے۔ شوق نمائش کا ادنیٰ سا اثر بھی جہاں محسوس ہو فوراً اس کا سدِ باب کرے۔ جماعتی مشوروں میں یہ بات کبھی اشارتاً و کنایتاً بھی برداشت نہ کی جائے کہ فلاں کام اس لیے کرنا چاہیے کہ وہ مقبولیت کا ذریعہ ہے اور فلاں کام اس لیے نہ کرنا چاہیے کہ لوگ اسے پسند نہیں کرتے۔ جماعت کا داخلی ماحول ایسا ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کی تعریف اور مذمت ہر دو سے بے نیاز ہو کر کام کرنے کی ذہنیت پیدا کرے۔ اور اس ذہنیت کی پرورش نہ کرے، جو مذمت سے دل شکستہ ہو اور تعریف سے غذا پائے۔ اس کے باوجود اگر کچھ افراد جماعت میں ایسے پائے جائیں، جن میں ریا کی بو محسوس ہو تو ان کی ہمت افزائی کرنے کے بہ جائے ان کے علاج کی فکر کرنی چاہیے۔

نیت کا کھوٹ

تیسرا بنیادی عیب نیت کا کھوٹ ہے، جس پر کسی خیر کی عمارت قائم نہیں ہوسکتی۔ خیر کا کام صرف اس خالص نیت ہی سے ہوسکتا ہے کہ دنیا میں بھلائی پھیلے اور ہم اس کے لیے سعی کر کے اللہ کے ہاں سُرخ رو ہوں۔ اس نیت کے ساتھ اپنی کوئی ذاتی یا گروہی غرض شامل نہ ہونی چاہیے۔ اپنا کوئی دنیوی مفاد پیش نظر نہ ہونا چاہیے حتیٰ کہ کسی تاویل کے ساتھ بھی اس مقصدِ خیر کے ساتھ اپنے اپنے کسی منفعت کی طلب یا امید کی لاگ لگی نہ رہنی چاہیے۔ ایسا ہر لوث نہ صرف یہ کہ اللہ کے ہاں آدمی کے اجر کو ضائع کر دے گا بلکہ دنیا میں بھی اس آلودگی کو لیے ہوئے کوئی صحیح کام نہ ہو سکے گا۔ نیت کی خرابی لامحالہ کردار پر اثر انداز ہوگی اور کردار کی خرابی کے ساتھ اس جدوجہد میں کامیاب ہونا ممکن نہیں ہے، جس کا اصل مقصود برائی کو مٹا کر بھلائی کو قائم کرنا ہے۔

یہاں پھر وہی مشکل پیش آتی ہے، جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ جزوی بھلائیوں کے لیے کام کرنے کی صورت میں نیت کو اس کھوٹ سے پاک رکھنا کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے۔ تھوڑا سا تعلق باللہ اور جذبۂ صادق بھی اس کے لیے کافی ہوسکتا ہے مگر جن لوگوں کے پیش نظر یہ ہو کہ ایک پورے ملک کے نظامِ زندگی کی اصلاح کی جائے اور اسے بہ حیثیتِ مجموعی ان بنیادوں پر استوار کیا جائے، جو اسلام نے ہمیں دی ہیں وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے صرف تعمیرِ افکار یا صرف تبلیغ و تلقین، یا صرف اصلاحِ اخلاق کی کوششوں پر اکتفا نہیں کر سکتے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انھیں لامحالہ ملک کے سیاسی نظام کا رُخ بھی اپنے مقصد کی طرف موڑنے کے لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے تاکہ اقتدار یا تو بہ راہِ راست ان کے ہاتھ میں آئے یا کسی ایسے گروہ کی طرف منتقل ہو، جسے ان کی تائید اور پشت پناہی حاصل ہو۔ دونوں صورتوں میں سے خواہ کوئی بھی صورت ہو، اقتدار کا تصوّر سیاسی نظام کی تبدیلی سے منفک نہیں ہوسکتا۔ اب تو قعرِ دریا میں رہ کر دامن تر نہ ہونے دینے کا معاملہ ہے کہ ایک جماعت یہ کام کرے اور پورے انہماک کے ساتھ کرے اور پھر بھی اس کے افراد کی انفرادی نیتوں اور پوری جماعت کی مجموعی نیت کو اپنے لیے اقتدار کی طلب کا لوث نہ لگنے پائے۔ یہ چیز بڑا مجاہدۂ نفس اور بڑا تزکیۂ قلب و روح چاہتی ہے۔

اس معاملے میں صحیح نقطۂ نظر پیدا کرنے کے لیے دو بہ ظاہر متماثل چیزوں کا جوہری فرق اچھی طرح ذہن نشین ہونا چاہیے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ مجموعی نظامِ زندگی کی تبدیلی چاہنے والا دوسری تبدیلیوں کے ساتھ سیاسی نظام کی تبدیلی آپ سے آپ اس امر کی مقتضی ہے کہ اقتدار ان لوگوں کی طرف یا ان کی پسند کے لوگوں کی طرف منتقل ہو، جو اس تبدیلی کے خواہش مند ہوں۔ مگر فرق اور بہت بڑا فرق ہے ''اپنے لیے'' اقتدار چاہنے اور اپنے اصول اور نصب العین کے لیے اقتدار چاہنے میں۔ اصول کا اقتدار چاہے عملاً اصول کے علم برداروں ہی کا اقتدار ہو۔ پھر بھی ''اصول کا اقتدار'' چاہنا اور اس کے علم برداروں کا ''اپنے لیے اقتدار چاہنا'' حقیقتاً دو الگ الگ چیزیں ہیں، جن میں رُوح اور جوہر کا بہت بڑا فرق ہے۔ نیت کا کھوٹ، دوسری چیز میں ہے، نہ کہ پہلی چیز میں اور مجاہدۂ نفس جس چیز پر مرکوز ہونا چاہیے، وہ یہ ہے کہ پہلی چیز کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے پر بھی دوسری چیز کا ذہن میں شائبہ تک نہ آنے پائے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ انھوں نے مجموعی نظامِ زندگی کو بدل کر اسلام کے اصولوں پر قائم کرنے کی جدّوجہد کی۔ یہ چیز سیاسی غلبہ و اقتدار کی بھی متقاضی تھی کیوں کہ دین کو پوری طرح غالب کر دینا اس کے بغیر ممکن نہ تھا اور عملاً اس جدوجہد کے نتیجے میں اقتدار ان کے ہاتھ میں آیا بھی لیکن اس کے باوجود کوئی ایمان دار آدمی یہ شبہ تک نہیں کر سکتا کہ ان کی جدوجہد کا مقصود ''اپنا اقتدار'' تھا۔ دوسری طرف اپنے اقتدار کے طالبوں سے تاریخ بھری پڑی ہے اور تاریخ میں ان کو ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ دنیا میں موجود ہیں۔ عملاً اقتدار پانے کو اگر ایک واقعہ کی حیثیت سے لیا جائے تو دونوں گروہوں میں کوئی فرق نہیں لیکن نیت کے لحاظ سے دونوں میں عظیم الشان فرق ہے۔ اس فرق پر دونوں کا کردار، جدوجہد کے دور کا کردار بھی اور کامیابی کے دور کا کردار بھی ناقابلِ انکار شہادت دے رہا ہے۔

جو لوگ صدقِ دل سے اصولِ اسلام کے مطابق زندگی کا ہمہ گیر اقتدار چاہتے ہوں انھیں فرداً فرداً بھی اس فرق کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اپنی نیت درست رکھنی چاہیے اور ان کی جماعت کو مجموعی طور پر اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ ''اپنا اقتدار چاہنے'' کی نیت کسی شکل میں بھی اس کے دائرے میں جگہ نہ پا سکے۔

(۶)

انسانی کمزوریاں

اس کے بعد دوسرا درجہ ان برائیوں کا ہے، جو اساس و بنیاد کو تو نہیں ڈھاتیں مگر اپنی تاثیر کے لحاظ سے کام بگاڑنے والی ہیں اور اگر تساہل و تغافل برت کر ان کو پرورش پانے کا موقع دیا جائے تو تباہ کن ثابت ہوتی ہیں۔ شیطان انھی ہتھیاروں سے خیر کی راہ مارنے اور انسانی کوششوں کو بھلائی سے بُرائی کی طرف موڑنے اور معاشرے میں فساد ڈلوانے کا کام لیتا ہے۔ اگرچہ معاشرے کی صحت کے لیے ہر حال میں ان عیوب کا سدّباب ضروری ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ ان افراد اور جماعتوں کو تو ان سے بالکل پاک رہنا چاہیے، جن کے پیش نظر اصلاح معاشرہ اور اقامتِ دینِ حق کا مقصدِ عظیم ہو۔

اس نوعیت کے عیوب کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا منبع دراصل انسان کی بعض مخصوص کمزوریاں ہیں، جن میں سے ہر ایک کمزوری عیوب کے ایک پورے خاندان کو جنم دیتی ہے۔ سہولتِ فہم کے لیے مناسب طریقہ یہ ہوگا کہ ہم ایک کمزوری کو لے کر پہلے اس کی حقیقت کو سمجھیں۔ پھر یہ دیکھیں کہ وہ کس طرح کس تدریج سے عیب آفریں بنتی ہے اور نشو ونما پاکر کیا خرابیاں پیدا کرتی ہے۔ اس طرح ہر برائی کا سرا ہم کو مل جائے گا اور ہم جان سکیں گے کہ اس کی اصلاح کے لیے کس جگہ مرہم تدبیر استعمال کرنا چاہیے۔

نفسانیت

انسان کی کمزوریوں میں سب سے بڑی اور سخت فساد انگیز کمزوری ''نفسانیت'' ہے۔ اس کی اصل تو حبِ نفس کا وہ فطری جذبہ ہے، جو بہ جائے خود کوئی بری چیز نہیں بلکہ اپنی حد

کے اندر ضروری بھی ہے اور مفید بھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ جذبہ انسان کی فطرت میں اس کی بھلائی کے لیے ودیعت فرمایا ہے تاکہ وہ اپنی حفاظت اور اپنی فلاح و ترقی کے لیے کوشش کرے لیکن جب یہی جذبہ شیطان کی اکساہٹ سے عشقِ نفس اور پرستش نفس اور خود مرکزیت میں تبدیل ہوجاتا ہے تو مصدر خیر ہونے کے بجائے منبع شر بن جاتا ہے اور پھر ہر درجۂ ارتقاء میں اس سے عیوب کا ایک نیا سلسلہ وجود میں آتا چلا جاتا ہے۔

خود پسندی

برائی کی طرف اس جذبے کی پیش قدمی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ آدمی اپنی جگہ اپنے آپ کو بے عیب اور مجموعۂ محاسن سمجھ بیٹھتا ہے۔ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا احساس کرنے سے اغماض برتتا ہے اور اپنے ہر نقص یا قصور کی تاویل کرکے اپنے دل کو مطمئن کرلیتا ہے کہ میں ہر لحاظ سے بہت اچھا ہوں۔ یہ خود پسندی پہلے ہی قدم پر اس کی اصلاح و ترقی کا دروازہ اس کے اپنے ہاتھوں بند کردیتی ہے۔

پھر جب یہ ''من چہ خوب'' کا احساس لیے ہوئے آدمی اجتماعی زندگی میں آتا ہے تو اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جو کچھ اس نے اپنے آپ کو فرض کررکھا ہے وہی کچھ دوسرے بھی اسے سمجھیں۔ وہ صرف تعریف و تحسین سننا چاہتا ہے۔ تنقید اسے گوارا نہیں ہوتی۔ خیر خواہانہ نصیحت تک سے اس کی خودی کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس طرح یہ شخص اپنے لیے داخلی وسائلِ اصلاح کے ساتھ خارجی وسائلِ اصلاح کا بھی سدِباب کرلیتا ہے۔

مگر کوئی شخص بھی دنیا میں ایسا نہیں ہوسکتا، جس کو اجتماعی زندگی میں ہر لحاظ سے اپنی خواہش اور اپنی پسند ہی کے مطابق حالات مل جائیں۔ خصوصیت کے ساتھ خود پسند اور خود پرست آدمی کو تو یہاں ہر طرف سے چرکے لگتے ہیں کیوں کہ اس کی خودی اپنے اندر وہ اسباب لیے ہوئے آتی ہے، جو معاشرے کی بے شمار خوبیوں کے ساتھ اس کا تصادم ناگزیر کرادیتے ہیں اور معاشرے کے مجموعی حالات بھی اس کی توقعات اور خواہشات سے خواہ مخواہ ٹکراتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اس شخص کو صرف اس حد پر نہیں رہنے دیتی کہ وہ بس اپنی اصلاح کے داخلی و خارجی وسائل سے محروم ہوکر رہ جائے بلکہ دوسروں کے تصادم سے چرکے اور توقعات کی شکست کے صدمے اس کی مجروح خودی کو پیہم ایک سے ایک شدید تر برائی میں مبتلا کرتے چلے جاتے ہیں۔

وہ بہت سے لوگوں کو زندگی میں اپنے سے بہتر پاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے متعلق وہ محسوس کرتا ہے کہ معاشرہ ان کو اس سے زیادہ وقعت دے رہا ہے۔ بہت سے لوگ اس کو وہ وقعت نہیں دیتے، جس کا وہ طالب ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ اس کے مراتب تک پہنچنے میں مانع ہوتے ہیں، جن کا وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتا ہے۔ بہت سے لوگ اس پر تنقید کرتے ہیں بلکہ اس کی تنقیص تک کر ڈالتے ہیں۔ یہ مختلف حالات اس کے دل میں کسی کے خلاف بغض اور کینے کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔ وہ دوسروں کے حالات کا تجسّس کرتا ہے۔ دوسروں کے عیب ڈھونڈتا ہے، غیبتیں کرتا ہے اور غیبتیں سن کر لذت لیتا ہے۔ چغلیاں کھاتا ہے۔ نجویٰ اور سرگوشیاں اور سازشیں کرتا پھرتا ہے۔ اگر اس کے اخلاق کی بندشیں ڈھیلی ہوں یا ان مشاغل میں پیہم مشغول رہنے سے ڈھیلی ہو جائیں تو پھر ان گناہوں سے بڑھ کر جھوٹ، افترا، بہتان اور دوسرے قبیح تر جرائم کا ارتکاب کرنے لگتا ہے۔ ان برائیوں کے چکّر میں پھنس کر وہ اخلاق کی انتہائی پستیوں تک پہنچنے سے نہیں بچ سکتا۔ اِلّا یہ کہ کسی مرحلے پر پہنچ کر اسے خود ہی اپنی اس ابتدائی غلطی کا احساس ہو جائے، جس نے اسے اس راستے پر ڈالا تھا۔

یہ کیفیت اگر کسی ایک شخص کی ہو تو اس سے کوئی اجتماعی فساد رونما نہیں ہوتا اس کا اثر زیادہ سے زیادہ چند اشخاص تک پہنچ کر رہ جاتا ہے لیکن اگر اسی نفسانیت کے بہت سے مریض موجود ہوں تو ان کے شر سے پوری اجتماعی زندگی میں فساد پھیل جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جہاں آپس کی بدظنی، تجسّس، عیب جوئی، غیبت اور چغل خوری کا ایک سلسلہ چل رہا ہو، وہاں بہت سے لوگ دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف برائی پال رہے ہوں اور بغض و حسد کی بنا پر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہوں۔ اور جہاں بہت سی مجروح خودیاں انتقام کے جذبات سے لبریز ہوں، وہاں پھوٹ پڑے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہاں کوئی چیز دھڑے بندیوں کو روک نہیں سکتی۔ وہاں کسی تعمیری تعاون کا تو درکنار تعلقات کی خوش گواری تک کا امکان باقی نہیں رہتا۔ ایسے ماحول میں کشیدگی اور کش مکش ناگزیر ہے اور وہ صرف نفسانیت کے مریضوں تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ اچھے خاصے نیک نفس لوگ اس میں مبتلا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک نیک نفس آدمی تو منہ پر تو بجا تنقید ہی کو نہیں، بے جا تنقید کو بھی گوارا کر سکتا ہے۔ مگر غیبت اس کے دل میں غبار پیدا کیے بغیر نہیں رہتی، اور اس کا کم از کم اتنا اثر تو ہوتا ہی ہے کہ غیبت کرنے والوں پر اعتماد کرنا اس کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ اس طرح ایک نیک نفس آدمی ان

سب زیادتیوں کو معاف کرسکتا ہے، جو بغض یا حسد کی بنا پر اس کے ساتھ کی جائیں، وہ بدگوئی، الزام تراشی، جھوٹے پروپیگنڈے اور ان سے بھی زیادہ اذیت بخش چیزوں کو بھی نظر انداز کرسکتا ہے، لیکن اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ جن لوگوں سے ان صفات کا ذاتی تجربہ اس کو ہو چکا ہو، ان سے وہ اطمینان کے ساتھ کوئی معاملہ کرسکے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس اجتماعی ماحول میں یہ عیوب بروئے کار آجاتے ہیں وہ کس طرح شیطان کی من بھاتی چراگاہ بن کر رہتا ہے۔ حتیٰ کہ اس میں بہتر سے بہتر آدمی بھی چاہے کش مکش سے بچ جائیں کشیدگی سے نہیں بچ رہ سکتے۔

اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ جو لوگ اصلاح و تعمیر کے لیے اجتماعی جدوجہد کرنا چاہتے ہوں، ان کی جماعت کا ان افراد سے پاک ہونا کس قدر ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نفسانیت کے جراثیم ایسی جماعت کے لیے طاعون اور ہیضے کے جراثیم سے زیادہ خطرناک ہیں۔ ان کی موجودگی میں کسی تعمیرِ صالح کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

توبہ و استغفار

شریعتِ الٰہی اس مرض کے آغاز سے اس کا علاج شروع کرتی ہے اور پھر ہر مرحلے پر اس کے سدِ باب کے لیے ہدایات دیتی ہے۔ قرآن و حدیث میں جگہ جگہ اہلِ ایمان کو توبہ و استغفار کی جو تلقین کی گئی ہے اس کا منشاء یہی ہے کہ مومن کسی وقت بھی اعجابِ نفس اور خود پسندی میں مبتلا نہ ہو۔ کبھی اپنے آپ کو بڑی چیز نہ سمجھے۔ ہر وقت اپنی کم زوریوں اور خامیوں کا احساس اور اپنی خطاؤں اور لغزشوں کا اعتراف ہی کرتا رہے اور بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دینے کے بعد بھی اس پر پھولنے کے بہ جائے عاجزی کے ساتھ اپنے خدا کے حضور یہی درخواست پیش کرے کہ خدمت میں کوتاہیاں رہ گئی ہیں ان سے درگزر فرمایا جائے۔ نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر مجموعۂ کمالات اور کون ہوسکتا ہے۔ اور آپ سے بڑا کارنامہ دنیا میں کس انسان نے انجام دیا ہے، مگر تاریخ کے اس عظیم ترین کارنامے کو انتہا تک پہنچا کر جب آپ فارغ ہوئے تو دربارِ الٰہی سے، جو تلقین آپ کو فرمائی گئی وہ یہ تھی:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ (النصر: ۱-۳)

''جب اللہ کی مدد آ گئی اور فتح نصیب ہوگئی اور تم نے لوگوں کو اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے دیکھ لیا تو اب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت چاہو، یقیناً وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

یعنی جو کارِ عظیم تم نے انجام دیا اس کے متعلق تم یہ سمجھو کہ اس کی تعریف تمھیں نہیں بلکہ تمھارے رب کو پہنچتی ہے، جس کے فضل و کرم سے تم اتنا بڑا کام کر دکھانے میں کامیاب ہوئے۔ اور اپنے متعلق تمھارا احساس یہی ہونا چاہیے کہ جو حقِ خدمت تھا وہ پھر بھی ادا نہ ہوا۔ اس لیے انعام مانگنے کے بجائے اپنے رب سے یہ دعا کرو کہ خدمت میں جو کچھ کسر رہ گئی ہے اس سے درگزر فرمائیے۔ چناں چہ بخاری میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ: کانَ رسول اللّٰہ ﷺ یکثر ان یقول قبل موتہ سبحان اللّٰہ و بحمدہ استغفر اللّٰہ و اتوب الیہ۔ ''رسول اللہؐ اپنی وفات سے پہلے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتا ہوں اور اللہ سے مغفرت مانگتا ہوں اور اس کے حضور توبہ کرتا ہوں۔'' اور ویسے بھی توبہ و استغفار ہمیشہ ہی آں حضورؐ کا معمول تھا۔ بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ انھوں نے حضورؐ کو فرماتے سنا کہ: واللّٰہ انی استغفر اللّٰہ و اتوب الیہ فی الیوم اکثر من سبعین مرۃ۔ ''خدا کی قسم! میں ہر روز ستّر مرتبہ سے زیادہ اللہ سے استغفار اور توبہ کرتا ہوں۔'' اس تعلیم کی روح اگر کوئی شخص اپنے اندر جذب کر لے تو اس کے ذہن میں نفسانیت کا وہ بیج کبھی جڑ ہی نہیں پکڑ سکتا، جو برگ و بار لا کر فتنہ و فساد کے بس بھرے پھل دیتا ہے۔

کلمۂ حق کا اظہار

اس پر بھی اگر نفس میں یہ خرابی پیدا ہو ہی جائے تو شریعتِ الٰہی اخلاق اور عملی رویّے میں اس کے ظہور اور نشو و نما کو ہر قدم پر روکتی ہے، اور اس کے بارے میں سخت احکام دیتی ہے۔ مثلاً اس کا پہلا ظہور اس شکل میں ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو تنقید سے بالاتر سمجھتا اور منوانے کی کوشش کرتا ہے اور اس بات کو برداشت نہیں کرتا کہ کوئی شخص اسے غلطی پر ٹوکے۔ شریعتِ الٰہی اس کے برعکس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو تمام اہلِ ایمان پر لازم کرتی ہے۔ اور خاص طور پر ذی اقتدار ظالموں کے مقابلے میں کلمۂ حق کہنے کو تو افضل الجہاد قرار دیتی ہے تاکہ مسلم معاشرے میں برائی پر ٹوکنے اور بھلائی کرنے کی تلقین کرنے کا ایسا ماحول پیدا ہو جائے، جس میں نفسانیت پنپ ہی نہ سکے۔

بغض وحسد

اس کا دوسرا ظہور بغض وحسد کی شکل میں ہوتا ہے، جسے آدمی ہر اس شخص کے خلاف دل میں پالنا شروع کر دیتا ہے، جس سے اس کی نفسانیت پر چوٹ لگی ہو اور پھر اس سے تعلقات کی خرابی کا آغاز ہوتا ہے۔ شریعتِ الٰہی اس چیز کو گناہ قرار دیتی ہے اور اس پر سخت وعید سناتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''خبردار حسد نہ کرو، کیوں کہ حسد آدمی کی نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے، جیسے آگ سوکھی لکڑیوں کو چٹ کر جاتی ہے۔'' احادیث میں متعدد الفاظ کے ساتھ حضورؐ کے یہ تاکیدی ارشادات وارد ہوئے ہیں کہ: ''ایک دوسرے سے قطع کلام نہ کرو۔ کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ تین دن سے زیادہ اپنے مسلمان بھائی سے تعلقات توڑے رکھے۔''

بدگمانی

اس کا تیسرا قدم بدگمانی کی طرف اٹھتا ہے اور پھر تجسّس کر کے آدمی دوسروں کے عیوب ٹٹولنے لگتا ہے۔ بدگمانی کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے سوا ہر ایک کے متعلق یہ ابتدائی مفروضہ قائم کرتا ہے کہ وہ ضرور برا ہے اور بہ ظاہر اس کی جو چیز قابلِ اعتراض نظر آتی ہے اس کی کوئی اچھی توجیہ کرنے کے بہ جائے ہمیشہ بری توجیہ کرتا ہے اور تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا۔ تجسّس اسی بدگمانی کا ایک شاخسانہ ہے۔ آدمی دوسروں کے متعلق پہلے ایک بری رائے قائم کرتا ہے پھر اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے ان کے حالات کی ٹوہ لگانی شروع کرتا ہے۔ قرآن ان دونوں چیزوں کو گناہ قرار دیتا ہے۔ سورۂ حجرات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا ''بہت گمان کرنے سے بچو کیوں کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور تجسّس نہ کرو۔'' حدیث میں نبی کریمؐ کا ارشاد ہے: ''خبردار بدگمانی نہ کرو۔ کیوں کہ بدگمانی بدترین جھوٹ ہے۔'' حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ہم کو ٹوہ لگانے اور عیوب ٹٹولنے سے منع کیا گیا ہے۔ البتہ اگر ہمارے سامنے کوئی بات کھل جائے تو ہم اس کو پکڑیں گے۔ حضرت معاویہؓ کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم مسلمانوں کے پوشیدہ احوال کی کھوج کرید کرو گے تو ان کو بگاڑ دو گے۔''

غیبت

ان مراحل کے بعد غیبت کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد خواہ بدگمانی پر ہو، یا

حقیقت پر، دونوں صورتوں میں کسی شخص کو ذلیل کرنے اور اس کی تذلیل سے لذت یا فائدہ اٹھانے کی خاطر اس کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرنا غیبت ہے۔ حدیث میں اس کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ: ''تیرا اپنے بھائی کی غیر موجودگی میں اس کا ذکر اس طرح کرنا کہ اسے معلوم ہو تو ناگوار ہو۔ نبی کریمؐ سے پوچھا گیا کہ اگر ہمارے بھائی میں وہ برائی موجود ہو، جس کا ذکر کیا گیا ہے تو کیا پھر بھی غیبت ہوگی؟ فرمایا: اگر اس میں وہ برائی ہے اور تو نے بیان کی تو غیبت کی، اور اگر اس میں وہ نہیں ہے تو غیبت سے بڑھ کر بہتان لگایا۔'' قرآن اس فعل کو حرام قرار دیتا ہے۔ سورۂ حجرات میں ارشاد ہے: وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ۔ ''اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، اس سے تم ضرور نفرت کرو گے۔'' نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: ''ہر مسلمان کی جان و مال اور عزت دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔'' اس سے مستثنیٰ صرف وہ صورتیں ہیں، جن میں کسی کی برائی کرنے کی جائز ضرورت ہے اور اس میں بدخواہی کی نیت نہ ہو۔ مثلاً کسی مظلوم کی شکایت اس لیے کرنا کہ کوئی اس کی فریاد رسی کرے۔ اس کی اجازت خود قرآن میں دی گئی ہے: لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ''اللہ برائی پر زبان کھولنا پسند نہیں کرتا اِلّا یہ کہ کسی شخص پر ظلم ہوا ہو۔'' یا مثلاً ایک شخص دوسرے شخص سے بیٹی بیاہ رہا ہو یا اس سے کوئی کاروباری معاملہ طے کر رہا ہو، اور فریقین میں سے کوئی اس معاملے میں کسی جاننے والے سے مشورہ لے۔ اس صورت میں جو برائی واقعی آدمی کے علم میں ہو اسے خیر خواہی کی بنا پر بیان کر دینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ خود نبی کریم ﷺ نے ایسے مواقع پر برائی بیان کی ہے۔ چناں چہ حدیث میں آتا ہے کہ دو صاحبوں نے فاطمہ بنتِ قیسؓ کو نکاح کا پیغام دیا۔ انھوں نے حضور ﷺ سے مشورہ طلب کیا۔ آپؐ نے انھیں خبردار کیا کہ ان میں سے ایک صاحب کنگال ہیں، اور دوسرے صاحب بیویوں کو پیٹنے کے عادی ہیں۔ اسی طرح شریعت کو غیر معتبر راویوں کی روایت سے محفوظ کرنے کے لیے ان کے عیوب بیان کرنا تمام علماءِ امت نے بالاتفاق جائز رکھا اور ائمۂ حدیث نے عملاً اس خدمت کو انجام دیا کیوں کہ دین کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ خلقِ خدا پر علانیہ ظلم کرنے والوں اور فسق و فجور پھیلانے والوں اور کھلے کھلے بدکردار لوگوں کی غیبت کرنا بھی جائز ہے اور نبی کریمؐ کے اپنے عمل سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح مستثنیٰ صورتوں کے ماسوا غیبت ہر حال میں حرام ہے اور اس کا سننا بھی گناہ

ہے۔ سننے والوں پر لازم ہے کہ یا تو غیبت کرنے والوں کو روکیں یا اس شخص کی مدافعت کریں، جس کی غیبت کی جارہی ہو، یا بہ درجۂ آخر اس محفل سے اُٹھ جائیں، جہاں ان کے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھایا جارہا ہو۔

چغل خوری

غیبت سے جو آگ لگتی ہے اسے پھیلانے کی خدمت چغل خوری انجام دیتی ہے اور اس میں بھی اصل محرک وہی نفسانیت کا جذبہ ہوتا ہے۔ چغل خور کسی کا خیر خواہ بھی نہیں ہوتا۔ نہ اس کا جس کی برائی کی گئی ہو اور نہ اس کا جس سے برائی کی ہو۔ وہ دوست دونوں کا بنتا ہے مگر دراصل دونوں کا بدخواہ ہوتا ہے۔ اسی لیے ایک ایک کی بات کان لگا کر سنتا ہے اور اس کی تردید نہیں کرتا۔ پھر دوست کو اس کی خبر پہنچاتا ہے تاکہ جو آگ اب تک ایک جگہ لگی ہوئی تھی وہ دوسری جگہ بھی لگ جائے۔ شریعتِ الٰہی میں اس چیز کو حرام کیا گیا کیوں کہ یہ فساد انگیزی میں غیبت سے بھی بڑھ کر ہے۔ قرآن مجید میں جن اوصاف کو آدمی کی بدترین صفات میں شمار کیا گیا ہے ان میں سے ایک چغل خوری کرتے پھرنا بھی ہے۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: لایدخل الجنة نمّام ''کوئی چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوسکتا۔'' ایک دوسری حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''تم بدترین انسان اس شخص کو پاؤ گے، جس کے دو منھ ہیں۔ کچھ لوگوں کے پاس ایک منھ لے کر آتا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں کے پاس دوسرا منھ لے کر جاتا ہے۔'' صحیح اسلامی رویّہ یہ ہے کہ آدمی جہاں کسی کی غیبت سنے یا تو اس کی تردید کرے یا پھر فریقین کی موجودگی میں اس معاملے کو چھیڑ کر اس کی صفائی ایسے طریقے سے کرائے، جس سے ایک فریق کو یہ شبہ نہ ہو کہ دوسرے فریق نے اس کی موجودگی میں اس کی برائی کی تھی۔ اور اگر غیبت کسی ایسی برائی پر ہو، جو واقعی شخصِ مذکور میں پائی جاتی ہو تو ایک طرف غیبت کرنے والے کو اس کے گناہ پر متنبہ کرے اور دوسری طرف اس شخص کو بھی اپنی اصلاح کے لیے توجہ دلائے، جس کی برائی بیان کی گئی تھی۔

کھسر پھسر اور سرگوشیاں

اس سلسلۂ فساد کی انتہائی کڑی نجویٰ ہے یعنی کھسر پھسر، سرگوشیاں اور خفیہ مشورے، جن سے بالآخر سازشوں اور جتھہ بندیوں تک نوبت پہنچتی ہے اور ایک دوسرے کے خلاف کش مکش کرنے والے دھڑے وجود میں آتے ہیں۔ شریعتِ الٰہی اس کو بھی سختی کے ساتھ منع کرتی ہے۔

قرآن مجید میں اس کو ایک شیطانی حرکت قرار دیا گیا ہے: اِنَّمَا النَّجْوٰی مِنَ الشَّیْطَانِ۔ اور اس کے بارے میں یہ اصولی ہدایت دی گئی ہے کہ: اِذَا تَنَاجَیْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَ مَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰی۔ یعنی دو یا چند آدمیوں کی علیحدگی میں گفتگو کرنا اگر نیک مقاصد کے لیے اور تقویٰ کے حدود میں ہو تو اس نجویٰ کی تعریف میں نہیں آتا، جو ممنوع ہے۔ البتہ وہ گفتگو ضرور نجویٰ اور ممنوع نجویٰ ہے، جو جماعت سے آنکھ بچا کر اخفا کے اہتمام کے ساتھ اس غرض کے لیے کی جائے کہ کسی بڑے کام کی اسکیم بنانی ہے۔ یا کسی دوسرے شخص یا گروہ کے خلاف کوئی کارروائی کرنی ہے یا رسول اللہ ﷺ کے احکام و فرامین کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرنا ہے۔ ایمان دارانہ اور مخلصانہ اختلافات کبھی نجویٰ کے متحرک نہیں ہو سکتے۔ ان کی بات چیت کھلم کھلا ہوتی ہے۔ برسرِ عام جماعت کے سامنے ہوتی ہے۔ دلیل کے ساتھ قائل کرنے یا قائل ہونے کے لیے ہوتی ہے اور اس بات چیت سے اگر اختلافات باقی بھی رہ جاتے ہیں تو وہ کبھی موجبِ فساد نہیں ہوتے۔ جماعت سے الگ ہٹ کر اخفا کے اہتمام کے ساتھ سرگوشیاں کرنے کی ضرورت صرف انھی اختلافات میں پیش آتی ہے، جو اگر بالکل نفسانیت پر مبنی نہ بھی ہوں تو کم از کم ان میں نفسانیت کی آمیزش ضرور ہوتی ہے۔ ایسی سرگوشیاں کبھی نیک نتیجہ پیدا نہیں کرتیں۔ ان کی ابتدا چاہے کتنی ہی معصوم ہو، رفتہ رفتہ وہ پوری جماعت کو آپس کی بدگمانیوں، تفرقوں اور دھڑے بندیوں کی چھوت لگا دیتی ہیں۔ باہم پخت و پز کر کے جب چند آدمی ایک جتھے کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں تو پھر دوسرے لوگوں میں بھی ایسی ہی پخت و پز کرنے اور جتھے بنانے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے اور یہیں سے اس بگاڑ کی ابتدا ہوتی ہے، جو بہترین اہلِ خیر کی جماعتوں کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے باہم دست و گریباں کر دیتا ہے۔ آخری مرحلہ وہ ہے جب کہ یہ بگاڑ عملاً رونما ہو جائے۔ یہ وہ چیز ہے، جس سے نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو بار بار متنبہ کیا ہے۔ شدّت کے ساتھ ڈرایا ہے اور سختی کے ساتھ بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''شیطان اب اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ عرب میں جو لوگ نماز پڑھنے لگے ہیں، وہ پھر اس کی عبادت کرنے لگیں گے۔ اب اس کی ساری امیدیں صرف اس کے اندر بگاڑ پیدا کرنے اور ان کو باہم لڑانے ہی سے وابستہ رہ گئی ہیں۔ حتیٰ کہ آپؐ نے یہاں تک فرمایا کہ میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔'' اس طرح کی حالت پیدا ہو جانے کی صورت میں اہلِ ایمان کو جو طریقہ سکھایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اوّل تو آدمی خود فتنہ میں حصہ لینے سے

بچے، خوش قسمت ہے وہ جو فتنوں سے بچ گیا اور جو جتنا بھی اس سے دور رہے، اتنا ہی زیادہ بہتر ہے۔ اس حالت میں سونے والا جاگنے والے سے بہتر ہے اور کھڑا ہوا دوڑنے والے سے بہتر ہے۔ دوسرے اگر وہ حصہ لے تو لڑنے والوں سے ایک فریق بن کر نہیں بلکہ صدقِ دل سے اصلاح کی کوشش کرنے والا بن کر لے، جس کے متعلق صاف صاف ہدایات سورۂ حجرات کے پہلے رکوع میں دی گئی ہیں۔

نفسانیت کی اس حقیقت اور اس کے نشو ونما اور ظہور کے ان مراتب اور ہر مرتبے کے متعلق شریعتِ الٰہی کے ان احکام کو ذہن نشین کر لینا ان تمام لوگوں کے لیے ضروری ہے، جو خیر و اصلاح کی خدمت کرنے کے لیے مجتمع ہوں۔ ان میں سے ہر ایک شخص کو پوری کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو خود پسندی کے مرض سے بچائے اور ان اخلاقی و رُوحانی نقصانات کو سمجھے، جو اس مرض میں مبتلا ہونے سے پہنچتے ہیں۔ ان کی جماعت کو بھی بہ حیثیتِ مجموعی اس معاملے میں چوکنا رہنا چاہیے کہ کہیں اس کے اندر نفسانیت کے جراثیم کو انڈے بچے دینے کا موقع نہ مل جائے۔ انھیں اپنے دائرے میں کسی ایسے شخص کی ہمت افزائی نہ کرنی چاہیے، جو اپنے اندر تنقید سن کر بپھر جائے، اپنی غلطی کا اعتراف کرنے سے استکبار برتے، انھیں ہر اس شخص کو دبانا چاہیے، جس کی باتوں سے بغض و عداوت کی بو آئے یا جس کا طرزِ عمل یہ بتا رہا ہو کہ وہ کسی شخص سے ذاتی کدورت رکھتا ہے، انھیں ایسے لوگوں کی بھی خبر لینی چاہیے، جو دوسروں کے معاملے میں بدگمانی سے کام لیں یا دوسروں کے حالات کی ٹوہ لگا کر ان کے عیوب تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ انھیں اپنی سوسائٹی میں غیبت اور نمامی کا بھی سدّ باب کرنا چاہیے اور جہاں کہیں یہ بلا اپنا سر نکالے، وہاں فوراً وہ سیدھا سیدھا اسلامی رویہ اختیار کرنا چاہیے، جس کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے۔ انھیں خصوصیت کے ساتھ نجویٰ کے خطرات سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ جماعت میں تفرقے کی تمہید ہے۔ کسی مخلص آدمی کو اس بات کے لیے ہرگز راضی نہ ہونا چاہیے کہ کوئی شخص سرگوشی کر کے کسی اختلافی مسئلے میں اسے اپنا ساتھی بنائے اور جس وقت بھی اس امر کی ابتدائی علامات ظاہر ہوں کہ کچھ لوگ جماعت میں یہ طریقہ اختیار کر رہے ہیں، اُسی وقت جماعت کو ان کی اصلاح یا پھر ان کی سرکوبی کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ ان ساری کوششوں کے باوجود اگر جماعت کے اندر کسی جتھہ بندی کا فتنہ رونما ہو ہی جائے تو پھر مخلصین کا کام یہ نہیں ہے کہ خود بھی کونوں اور گوشوں میں خفیہ سرگوشیاں کر کے کوئی دوسرا جتھا بنانے کے لیے ساز باز شروع کر دیں، بلکہ انھیں اس فتنے سے اپنا دامن بچا

کر اس کو روکنے کے لیے انفرادی تدبیریں کرنی چاہئیں اور ان میں ناکام ہونے کے بعد جماعت کے سامنے کھلم کھلا اس معاملے کو لے آنا چاہیے۔ جس جماعت میں مخلص افراد کی کثرت ہوگی، وہ اس طرح کے فتنوں سے خبردار ہو کر فوراً ہی ان کا استیصال کر دے گی اور جس میں فتنہ پسند یا بے فکر افراد زیادہ ہوں گے وہ انھی فتنوں کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔

مزاج کی بے اعتدالی

دوسرا درجہ ان خرابیوں کا ہے، جس کے لیے موزوں ترین نام "مزاج کی بے اعتدالی" ہے۔ نفسانیت کے مقابلے میں یہ ایک معصوم نوعیت کی کمزوری ہے کیوں کہ اس میں کسی بدنیتی، کسی برے جذبے، کسی ناپاک خواہش کا دخل نہیں ہوتا ہے لیکن خرابی پیدا کرنے کی قابلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ نفسانیت کے بعد دوسرے نمبر پر آتی ہے۔ بسا اوقات اس کے اثرات و نتائج اتنے ہی خراب ہوتے ہیں، جتنے نفسانیت کے اثرات و نتائج۔

مزاج کی بے اعتدالی کا فطری نتیجہ نظر و فکر کی بے اعتدالی اور عمل و سعی کی بے اعتدالی ہے اور یہ چیز زندگی کے حقائق سے بہ راہِ راست متصادم ہوتی ہے۔ انسانی زندگی بے شمار متضاد عناصر کی مصالحت اور بہت سے مختلف عوامل کے مجموعی عمل کا نتیجہ ہے۔ جس دنیا میں انسان رہتا ہے اس کا بھی یہی حال ہے۔ انسانی افراد میں سے ہر ایک فرداً فرداً بھی ایسا ہی بنایا گیا ہے۔ اور انسانوں کے ملنے سے، جو اجتماعی ہیئت بنتی ہے اس کی کیفیت بھی یہی ہے۔ اس ساری زندگی میں کام کرنے کے لیے فکر و نظر کا ایسا توازن اور سعی و عمل کا ایسا اعتدال درکار ہے، جو مزاجِ کائنات کے توازن و اعتدال کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہو۔ حالات کے ہر پہلو پر نگاہ رکھی جائے، معاملات کے ہر رُخ کو دیکھا جائے۔ ضروریات کے ہر گوشے کو اس کا حق دیا جائے۔ فطرت کے ہر تقاضے کو ملحوظ رکھا جائے اور کمال درجے کا معیاری اعتدال چاہے نصیب نہ ہو مگر یہاں کامیابی کے لیے بہ ہر حال اعتدال ناگزیر ہے۔ جتنا بھی وہ معیار سے قریب ہوگا، اتنا ہی مفید ہوگا اور جس قدر وہ اس سے دور ہوگا اسی قدر زندگی کی حقیقتوں سے متصادم ہو کر نقصان کا موجب بنے گا۔ دنیا میں آج تک جتنا بھی فساد رونما ہوا ہے اور آج رونما ہے اسی وجہ سے ہے کہ غیر متوازن دماغوں نے انسانی مسائل یک رُخے پن سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوششیں کیں۔ ان کو حل کرنے کے لیے غیر متوازن اسکیمیں بنائیں اور ان کو نافذ کرنے کے لیے غیر معتدل طریقے

اختیار کیے۔ یہی بگاڑ کا اصل سبب ہے اور بناؤ کا جو کچھ کام بھی ہوسکتا ہے فکر ونظر کے توازن اور طریقِ عمل کے اعتدال ہی سے ہوسکتا ہے۔

یہ وصف خاص طور پر تعمیر و اصلاح کی اس اسکیم کو نافذ کرنے کے لیے اور بھی زیادہ ضروری ہے، جو اسلام نے ہمیں دی ہے۔ کیوں کہ وہ بہ جائے خود توازن و اعتدال کے انتہائی کمال کا نمونہ ہے۔ اس کو کتابوں کے صفحات سے واقعات کی دنیا میں منتقل کرنے کے لیے تو خصوصیت کے ساتھ وہی کارفرما اور کارکن موزوں ہوسکتے ہیں، جن کی نظر اسلام کے نقشۂ تعمیر کی طرح متوازن اور جن کا مزاج اسلام کے مزاجِ اصلاح کی طرح معتدل ہو۔ افراط و تفریط میں مبتلا ہونے والے انتہا پسند لوگ اس کام کو بگاڑ تو سکتے ہیں، بنا نہیں سکتے۔

نتائج کے اعتبار سے بے اعتدالی کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ وہ بالعموم ناکامی کی موجب ہوتی ہے۔ نظامِ زندگی میں اصلاح و تغیر کی کوئی اسکیم بھی لے کر آپ اٹھیں، آپ کی کامیابی کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ آپ خود اس کے برحق ہونے پر مطمئن ہوں، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ اپنے معاشرے کے عام انسانوں کو اس کے صحیح، مفید اور قابلِ عمل ہونے پر مطمئن کردیں اور اپنی تحریک کو اس شکل میں لائیں اور ایسے طریقے سے چلائیں، جس سے لوگوں کی امیدیں اور رغبتیں اس کے ساتھ وابستہ ہوتی چلی جائیں۔ یہ بات صرف اسی تحریک کو نصیب ہوسکتی ہے، جو فکر و نظر میں بھی متوازن ہو اور طریقِ عمل میں بھی متوازن، ایک انتہا پسندانہ اسکیم جو انتہا پسندانہ طریقوں سے چلائی جائے عام انسانوں میں اپنے لیے رغبت اور امید پیدا کرنے کے بہ جائے معترض اور غیر مطمئن بناتی ہے اور اس کی یہ صفت خود ہی اس کی قوتِ تبلیغ اور قوتِ نفوذ کو ضائع کردیتی ہے۔ اس کو بنانے اور چلانے کے لیے کچھ انتہا پسند لوگ اکٹھے ہو بھی جائیں تو سارے معاشرے کو اپنے جیسا انتہا پسند بنالینا اور دنیا بھر کی آنکھیں حقائق سے بند کردینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

خود اس جماعت کے لیے بھی یہ چیز زہر کا حکم رکھتی ہے، جو اجتماعی اصلاح و تعمیر کا کوئی پروگرام لے کر اٹھتی ہو۔

یک رخاپن

مزاج کی بے اعتدالی کا اولین مظہر انسان کے ذہن کا یک رُخاپن ہے۔ اس کیفیت میں مبتلا ہوکر آدمی بالعموم ہر چیز کا ایک رُخ دیکھتا ہے دوسرا رخ نہیں دیکھتا۔ ہر معاملے میں ایک

پہلو کا لحاظ کرتا ہے دوسرے کسی پہلو کا لحاظ نہیں کرتا۔ ایک سمت جس میں اس کا ذہن ایک دفعہ چل پڑتا ہے اسی کی طرف وہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دوسری سمتوں کی جانب توجہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس سے معاملات کو سمجھنے میں مسلسل ایک خاص طرح کا عدمِ توازن کا ظہور ہوتا ہے۔ رائے قائم کرنے میں بھی وہ ایک ہی طرف جھکتا چلا جاتا ہے۔ جس چیز کو اہم سمجھ لیتا ہے، بس اسی کو پکڑ بیٹھتا ہے۔ دوسری ویسی ہی اہم چیزیں بلکہ اس سے بھی اہم چیزیں اس کے نزدیک غیر وقیع ہوجاتی ہیں۔ جس چیز کو برا سمجھ لیتا ہے، اسی کے پیچھے پڑ جاتا ہے، دوسری ویسی ہی بلکہ اس سے زیادہ بڑی برائیاں اس کے نزدیک قابلِ توجہ نہیں ہوتیں۔ اصولیت اختیار کرتا ہے تو جمود کی حد تک اصول پرستی میں شدّت دکھانے لگتا ہے۔ کام کے عملی تقاضوں کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ عملیت کی طرف جھکتا ہے تو بے اصولی کی حد تک عملی بن جاتا ہے اور کامیابی کو مقصود بالذات بنا کر اس کے لیے ہر قسم کے ذرائع و وسائل استعمال کر ڈالنا چاہتا ہے۔

انتہا پسندی

یہ کیفیت اگر اس حد پر نہ رُک جائے تو آگے بڑھ کر یہ سخت انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر آدمی اپنی رائے پر ضرورت سے زیادہ اصرار کرنے لگتا ہے۔ اختلاف رائے میں شدّت برتنے لگتا ہے۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کو انصاف کے ساتھ نہ دیکھتا ہے اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ ہر مخالف رائے کو بدتر سے بدتر معنی پہنا کر ٹھکرانا اور ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ یہ چیز روز بہ روز اسے دوسروں کے لیے اور دوسروں کو اس کے لیے ناقابلِ برداشت بناتی چلی جاتی ہے۔

اس مقام پر بھی بے اعتدالی رُک جائے تو خیریت ہے۔ لیکن اگر اسے خوبی سمجھ کر مزید پرورش کیا جائے تو پھر معاملہ بدمزاجی اور چڑچڑے پن اور تیز زبانی اور دوسروں کی نیتوں پر شک اور حملوں تک پہنچ جاتا ہے، جو کسی اجتماعی زندگی میں نبھنے والی چیز نہیں ہے۔

اجتماعی بے اعتدالی

ایک آدمی یہ روش اختیار کرے تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہوگا کہ وہ اکیلا جماعت سے کٹ جائے گا اور اس مقصد کی خدمت سے محروم ہوجائے گا، جس کی خاطر وہ جماعت سے وابستہ ہوا تھا اس سے کوئی اجتماعی نقصان نہ ہوگا، مگر جب کسی اجتماعی ہیئت میں بہت سے غیر متوازن ذہن اور غیر معتدل مزاج جمع ہوجائیں تو پھر ایک ایک قسم کا عدمِ توازن ایک ایک ٹولی کی شکل

اختیار کرنے لگتا ہے۔ ایک انتہا کے جواب میں دوسری انتہا پیدا ہوتی ہے۔ اختلافات شدید سے شدید تر ہوتے جاتے ہیں۔ پھوٹ پڑتی ہے، دھڑے بندی ہوتی ہے اور اس کش مکش میں وہ کام خراب ہو کر رہتا ہے، جسے بنانے کے لیے بڑی نیک نیتی کے ساتھ کچھ لوگ جمع ہوئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کام انفرادی کوششوں سے کرنے کے نہیں ہوتے بلکہ جن کی نوعیت ہی اجتماعی ہوتی ہے، انھیں انجام دینے کے لیے بہ ہر حال بہت سے لوگوں کو ساتھ مل کر کام کرنا ہوتا ہے۔ ہر ایک کو اپنی بات سمجھانی اور دوسروں کی بات سمجھنی ہوتی ہے۔ طبیعتوں کا اختلاف، قابلیتوں کا اختلاف، ذاتی خصوصیات کا اختلاف اپنی جگہ رہتا ہے۔ اس کے باوجود سب کو آپس میں موافقت کا ایک تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے، جس کے بغیر کوئی تعاون ممکن نہیں ہوتا۔ اس موافقت کے لیے کسر و انکسار ناگزیر ہے اور یہ کسر و انکسار صرف معتدل مزاج کے لوگوں ہی میں ہو سکتا ہے، جن کے خیالات بھی متوازن ہوں اور طبیعتیں بھی۔ متوازن غیر متوازن لوگ بھی جمع ہو جائیں تو زیادہ دیر تک جمع نہیں رہ سکتے۔ ان کی جمعیت پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی، اور جن ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر ایک ایک قسم کے عدمِ توازن کے مریض جمع ہوں گے ان میں پھر تفرقہ رونما ہوگا یہاں تک کہ آخر کار ایک ایک امام مقتدیوں کے بغیر ہی کھڑا نظر آئے گا۔

جن لوگوں کو اسلام کے لیے کام کرنا ہو اور جنھیں جمع کرنے والی چیز اسلامی اصول پر نظامِ زندگی کی اصلاح و تعمیر کرنے کا جذبہ ہو و ولولہ ہو، انھیں اپنا محاسبہ کر کے اس بے اعتدالی کی ہر شکل سے خود بھی بچنا چاہیے اور ان کی جماعت کو بھی یہ فکر ہونی چاہیے کہ اس کے دائرے میں یہ مرض نشو و نما نہ پائے۔ اس باب میں کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کی وہ ہدایات ان کے پیشِ نظر رہنی چاہئیں، جو انتہا پسندی اور شدّت سے منع کرتی ہیں۔ قرآن جس چیز کو اہلِ کتاب کی بنیادی غلطی قرار دیتا ہے وہ غلو فی الدین ہے: یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ اور اس سے بچنے کی تاکید نبیِ کریم ﷺ اپنے متبعین کو ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

ایاکم و الغلوّ فانما ھلک من کان قبلکم بالغلوّ فی الدّین

''خبردار انتہا پسندی میں نہ پڑنا کیوں کہ تم سے پہلے کے لوگ دین میں انتہا پسندی اختیار کر کے ہی تباہ ہوئے ہیں۔''

ابنِ مسعودؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک تقریر میں تین بار فرمایا: ھلک المتنطّعون

''برباد ہو گئے شدت اختیار کرنے والے مبالغے اور تعمق سے کام لینے والے۔'' دعوتِ محمدیؐ کا امتیازی وصف اس کے لانے والے نے یہ بتایا ہے: بعثت بالحنیفیة السمحة۔ یعنی آپ پچھلی امتوں کے افراط و تفریط کے درمیان وہ حنیفیت لے کر آئے ہیں، جس میں وسعت اور معاملاتِ زندگی کے ہر پہلو کی رعایت ہے۔ اس دعوت کے علم برداروں کو جس طریقے پر کام کرنا چاہیے، وہ اس کے داعیِ اوّل نے یہ سکھایا ہے: یسّروا ولا تعسّروا و بشروا ولا تنفروا۔ ''سہولت دو، تنگ نہ کرو، بشارت دو، نفرت نہ دلاؤ۔'' انما بعثتم میسّرین ولم تبعثوا معسرین۔ ''تم سہولت دینے کے لیے بھیجے گئے ہو۔ تنگ کرنے کے لیے نہیں بھیجے گئے۔''

ما خیر رسول اللّٰہ ﷺ بین امرین قطّ الا اخذ ایسرھما مالم یکن اثما۔ (بخاری)

''کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رسولؐ کو دو معاملوں میں سے ایک کے اختیار کرنے کا موقع دیا گیا ہو اور آپؐ نے ان میں سے آسان ترین کو اختیار نہ کیا ہو، اِلا یہ کہ وہ گناہ ہو۔''

ان اللّٰہ رفیق یحب الرفق فی الامر کلہ۔ (بخاری مسلم)

''اللہ نرم خو ہے اور ہر معاملے میں نرم رویّے کو پسند کرتا ہے۔''

من یحرم الرفق یحرم الخیر کلہ۔ (مسلم)

''جو نرم خوئی سے محروم ہوا وہ بھلائی سے بالکل محروم ہو گیا۔''

ان اللّٰہ رفیق یحب الرفق و یعطی علی الرّفق مالا یعطی علی العنف ومالا یعطی علی ما سواہ۔ (مسلم)

''اللہ نرم خو ہے اور نرم خو آدمی کو پسند کرتا ہے، وہ نرمی پر وہ کچھ عطا کرتا ہے، جو شدت پر اور کسی دوسرے رویّے پر عطا نہیں کرتا۔''

ان جامع ہدایات کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ اسلامی نظامِ زندگی کے لیے کام کرنے والے لوگ اگر قرآن و سنت سے اپنے مطلب کی چیزیں چھانٹنے کے بجائے اپنے مزاج اور نقطۂ نظر کو ان کے مطابق ڈھالنے کی عادت ڈالیں تو ان کے اندر آپ سے آپ وہ توازن اور توسط و اعتدال پیدا ہوتا چلا جائے گا، جو دنیا کے حالات و معاملات کو قرآن و سنت کے دیے ہوئے نقشے پر درست کرنے کے لیے درکار ہے۔

تنگ دلی

مزاج کی بے اعتدالی سے ملتی جلتی ایک اور کمزوری بھی انسان میں ہوتی ہے، جسے تنگ دلی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، جسے قرآن میں ''شحِ نفس'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ فلاح اس شخص کے لیے ہے، جو بچ گیا: وَ مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَo اور جسے قرآن تقویٰ اور احسان کے برعکس ایک غلط میلان قرار دیتا ہے: وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ط وَ اِنْ تُحْسِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًاo (النساء:۱۲۸) اس مرض میں جو شخص مبتلا ہو، وہ اپنی زندگی کے ماحول میں دوسروں کے لیے کم ہی گنجائش چھوڑنا چاہتا ہے۔ وہ خود جتنا بھی پھیل جائے اپنی جگہ اسے تنگ ہی نظر آتی ہے اور دوسرے جس قدر بھی اس کے لیے سکڑ جائیں، اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ اپنے لیے وہ ہر رعایت چاہتا ہے مگر دوسروں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرسکتا۔ اپنی خوبیاں اس کے نزدیک ایک صفت ہوتی ہیں اور دوسروں کی خوبیاں محض ایک اتفاقی حادثہ۔ اپنے عیوب اس کی نگاہ میں قابلِ معافی ہوتے ہیں، مگر دوسروں کا کوئی عیب وہ معاف نہیں کرسکتا، اپنی مشکلات کو تو وہ مشکلات سمجھتا ہے مگر دوسروں کی مشکلات اس کی رائے میں محض بہانہ ہوتی ہیں۔ اپنی کم زوریوں کے لیے، جو الاؤنس وہ خود چاہتا ہے دوسروں کو وہ الاؤنس دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ دوسروں کی مجبوریوں کی پروا کیے بغیر وہ ان سے انتہائی مطالبات کرتا ہے، جو خود اپنی مجبوری کی صورت میں وہ کبھی پورے نہ کرے۔ اپنی پسند اور اپنا ذوق وہ دوسروں پر ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے مگر دوسروں کی پسند اور ان کے ذوق کا لحاظ کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ یہ چیز ترقی کرتی ہے تو آگے چل کر خورد گیری و عیب چینی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ دوسروں کی ذرا ذرا سی باتوں پر آدمی گرفت کرنے لگتا ہے اور پھر جوابی عیب چینی پر بلبلا اٹھتا ہے۔

اسی تنگ دلی کی ایک اور شکل زود رنجی، نک چڑھا پن اور ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنا ہے، جو اجتماعی زندگی میں اس شخص کے لیے بھی مصیبت ہے، جو اس میں مبتلا ہو اور ان لوگوں کے لیے بھی مصیبت، جنھیں ایسے شخص سے واسطہ پڑے۔

کسی جماعت کے اندر اس بیماری کا گھس آنا حقیقت میں ایک خطرے کی علامت ہے، اجتماعی جدوجہد بہ ہر حال آپس کی الفت اور باہمی تعاون چاہتی ہے، جس کے بغیر چار آدمی مل کر بھی کام نہیں کرسکتے۔ مگر یہ تنگ دلی اس کے امکانات کو کم ہی نہیں، بسا اوقات ختم کردیتی ہے۔

اس کا لازمی نتیجہ تعلقات کی تلخی اور باہمی منافرت ہے۔ یہ دلوں کو پھاڑ دینے والی اور ساتھیوں کو آپس میں الجھا دینے والی چیز ہے۔ اس مرض میں، جو لوگ مبتلا ہوں وہ عام معاشرتی زندگی کے لیے بھی موزوں نہیں ہو سکتے، کجا کہ کسی مقصدِ عظیم کی خدمت کے لیے موزوں قرار پا سکیں۔ خصوصیت کے ساتھ یہ صفت اِن صفات کے بالکل ہی برعکس ہے، جو اسلامی نظامِ زندگی کے قیام کی جدّوجہد کے لیے مطلوب ہیں۔ وہ تنگ دلی کے بہ جائے فراخ دلی، بخل کے بہ جائے فیاضی، گرفت کے بہ جائے عفو و درگزر اور سخت گیری کے بہ جائے مراعات چاہتا ہے۔ اس کے لیے حلیم اور متحمل لوگ درکار ہیں۔ اس کا بیڑا وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں، جو بڑا ظرف رکھتے ہوں۔ جن کی سختی اپنے لیے اور نرمی دوسروں کے لیے ہو، جو خود کم سے کم الاؤنس چاہیں اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ الاؤنس دیں۔ جو اپنے عیوب اور دوسروں کی خوبیوں پر نگاہ رکھیں۔ جو تکلیف دینے کے بہ جائے تکلیف سہنے کے خوگر ہوں اور چلتوں کو گرانے کے بہ جائے گرتوں کو تھامنے کا بل بوتا رکھتے ہوں، جو جماعت ایسے لوگوں پر مشتمل ہوگی، وہ نہ صرف خود آپس میں مضبوطی کے ساتھ جڑی رہے گی بلکہ اپنے گرد و پیش معاشرے میں بھی بکھرے ہوئے اجزا کو سمیٹتی اور اپنے ساتھ جوڑتی چلی جائے گی۔ اس کے برعکس تنگ دل اور کم ظرف لوگوں کا مجمع خود بھی بکھرے گا اور باہر بھی جس سے اس کو سابقہ پیش آئے گا، اُسے نفرت دلا کر اپنے سے دور بھگا دے گا۔

ضعفِ ارادہ

انسانوں میں ایک کم زوری بہ کثرت پائی جاتی ہے، جسے ہم ضعفِ ارادے کا نام دے سکتے ہیں۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک تحریک کی دعوت سن کر اسے صدقِ دل سے لبیک کہتا ہے اور اوّل اوّل خاصا جوش بھی دکھاتا ہے، مگر وقت گزرنے کے ساتھ اس کی دل چسپی کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے نہ اس مقصد سے کوئی حقیقی لگاؤ باقی رہتا ہے، جس کی خدمت کے لیے وہ آگے بڑھا تھا اور نہ اس جماعت کے ساتھ کوئی عملی وابستگی باقی رہتی ہے، جس میں وہ دلی رغبت کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ اس کا دماغ بدستور ان دلائل پر مطمئن رہتا ہے، جن کی بنا پر اس تحریک کو اس نے برحق مانا تھا، اس کی زبان بدستور اس کے برحق ہونے کا اقرار کرتی رہتی ہے، اس کے دل کی شہادت بھی یہی رہتی ہے کہ یہ کام کرنے کا ہے اور ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں اور قوائے عمل کی حرکت سست ہوتی چلی جاتی

ہے۔ اس میں کسی بدنیتی کا ذرّہ برابر دخل نہیں ہوتا، مقصد سے انحراف بھی نہیں ہوتا۔ نظریّے کی تبدیلی بھی قطعاً واقع نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے آدمی جماعت کو چھوڑنے کا خیال نہیں کرتا، مگر بس وہ ارادے کی کم زوری ہوتی ہے، جو ابتدائی جوش ٹھنڈا ہوجانے کے بعد مختلف شکلوں میں اپنے کرشمے دکھانے شروع کردیتی ہے۔

ضعفِ ارادے کا ابتدائی ظہور کام چوری کی صورت میں ہوتا ہے۔ آدمی ذمے داریاں قبول کرنے سے جی چرانے لگتا ہے۔ مقصد کی راہ میں وقت، محنت اور مال خرچ کرنے سے گریز کرنے لگتا ہے۔ دنیا کے ہر دوسرے کام کو اس کام پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ وہ جیسے زندگی کا نصب العین قرار دے کر آیا تھا۔ اس کے اوقات میں، اس کی محنتوں میں، اس کے مال میں، اس کے نام نہاد مقصدِ حیات کا حصہ کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے اور جس جماعت کو وہ برحق جماعت مان کر اس سے وابستہ ہوا تھا۔ اس کے ساتھ بھی وہ صرف نظم اور ضابطے کا تعلق باقی رکھتا ہے۔ اس کے بھلے اور برے سے کوئی غرض نہیں رکھتا، نہ اس کے معاملات میں کسی قسم کی دل چسپی لیتا ہے۔

یہ حالت کچھ اس طرح بہ تدریج طاری ہوتی ہے، جیسے جوانی یا بڑھاپا آتا ہے مگر آدمی اپنی اس کیفیت پر نہ خود متنبہ ہو اور نہ کوئی اسے متنبہ کرے، تو کسی وقت بھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ جس چیز کو میں اپنا مقصدِ زندگی قرار دے کر جان و مال کی بازی لگانے کے لیے اُٹھا تھا اس کے ساتھ اب یہ معاملہ کرنے لگا ہوں۔ یوں محض غفلت اور بے خبری کے عالم میں آدمی کی دل چسپی و وابستگی بے جان ہوتی چلی جاتی ہے، حتیٰ کہ کسی روز بے خبری ہی میں اس کی طبعی موت واقع ہوجاتی ہے۔

جماعتی زندگی میں اگر پہلے آدمی کے اندر اس کیفیت کے ظہور کا نوٹس نہ لیا جائے اور اس کے نشو و نما کو روکنے کی فکر نہ کی جائے تو ایک ضعیف الارادہ شخص کی چھوت دوسرے تمام ان لوگوں کو لگنا شروع ہوجاتی ہے، جن کے اندر ضعفِ ارادہ پیدا ہو رہا ہو، اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ اچھے خاصے سرگرم آدمی دوسروں کو کام نہ کرتے دیکھ کر خود بھی کام چھوڑ بیٹھتے ہیں اور کوئی اللہ کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ میں کسی اور کے نہیں، خود اپنے مقصدِ حیات کی خدمت کے لیے آیا تھا۔ اگر دوسرے اپنا مقصد چھوڑ چکے ہیں تو میں اپنے مقصد سے کیوں دست بردار ہوجاؤں۔ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہوتی ہے، جو صرف اس لیے جنت کے راستے پر چلنا چھوڑ دے کہ دوسرے ساتھیوں نے چھوڑ دیا ہے۔ گویا جنت اس کی اپنی منزلِ مقصود نہ تھی یا وہ اس شرط کے

ساتھ جانا چاہتا تھا کہ دوسرے بھی وہاں جائیں اور شاید دوسروں ہی کے ساتھ وہ جہنم جانے کا ارادہ بھی کرے۔ اگر انھیں اس طرف جاتے دیکھے کیوں کہ اس کا اپنا مقصد کوئی نہیں ہے۔ جو کچھ دوسروں کا مقصد ہے وہی اس کا بھی ہے۔ اس ذہنی کیفیت میں مبتلا ہوجانے والے لوگ ہمیشہ کام نہ کرنے والوں کی مثال بناتے ہیں، کام کرنے والوں میں انھیں کوئی قابلِ تقلید مثال نہیں ملتی۔

تاہم بسا غنیمت ہے کہ کوئی شخص بس سیدھے سادھے طریقے پر ضعفِ ارادہ کی بنا پر سست پڑ جائے اور سست ہی پڑ کر رہ جائے لیکن انسانی فطرت جب ایک دفعہ کم زوری میں مبتلا ہوجاتی ہے تو دوسری کم زوریاں بھی ابھرنے لگتی ہیں اور کم ہی لوگ اس پر قادر ہوتے ہیں کہ اپنی ایک کم زوری کی مدد پر دوسری کم زوریوں کو نہ آنے دیں۔ بالعموم آدمی کو اس میں شرم محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک کم زور انسان کی حیثیت سے ظاہر کرے یا اسے برداشت کرلے جائے کہ لوگ اسے کم زور سمجھیں، وہ سیدھی طرح اس کا اعتراف نہیں کرتا کہ ضعفِ ارادہ نے اسے سست کردیا ہے۔ اس کے بہ جائے وہ اس پر پردہ ڈالنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے، جن میں سے ہر طریقہ دوسرے سے بدتر ہوتا ہے۔

مثلاً وہ کام نہ کرنے کے لیے طرح طرح کے بہانے کرتا ہے اور آئے دن کوئی نہ کوئی عذر لنگ پیش کرکے ساتھیوں کو یہ فریب دینے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے کام نہ کرنے کا اصل سبب مقصد سے لگاؤ اور دل چسپی میں کمی نہیں ہے بلکہ واقعی رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہیں۔ یہ گویا سستی کی مدد پر جھوٹ کو بلانا ہے اور یہاں سے اس آدمی کا اخلاقی تنزل شروع ہوتا ہے، جس نے اوّل اوّل صرف ترقی کی بلندیوں پر چڑھنا چھوڑ دیا تھا۔

یہ حیلہ جب پرانا ہوکر بے کار ثابت ہونے لگتا ہے اور آدمی کو خطرہ ہوتا ہے کہ اب اصل کم زوری کا راز فاش ہوا چاہتا ہے تو وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ دراصل کم زوری کی وجہ سے سست نہیں ہوا ہے بلکہ جماعت کی کچھ خرابیوں نے اسے بددل کردیا ہے۔ گویا آپ خود تو بہت کچھ کرنا چاہتے تھے مگر کیا کریں، ساتھیوں کے بگاڑ نے دِل توڑ کر رکھ دیا۔ اس طرح یہ گرتا ہوا انسان جب ایک قدم نہیں جما سکتا تو اور زیادہ نیچے اتر جاتا ہے اور اپنی کم زوری کو چھپانے کی خواہش اسے یہ مظلمہ اپنی گردن پر لینے کے لیے آمادہ کردیتی ہے کہ جس کام کو بنانے کے قابل وہ نہ رہا تھا اسے اب بگاڑنے کی کوشش شروع کردے۔

ابتدائی مرحلے میں یہ بددلی کا معاملہ مجمل رہتا ہے، کچھ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت کیوں

بددل ہیں، خرابیوں کی مبہم شکایتیں دبی زبان سے ظاہر ہوتی ہیں، مگر ان کی کوئی تفصیل معلوم نہیں ہوتی۔ ساتھی اگر حکمت سے کام لیں اور اصل مرض کو سمجھ کر اس کا مداوا کرنے کی فکر کریں تو یہ گرتا ہوا شخص مزید گرنے سے رک بھی سکتا ہے اور اوپر اٹھایا بھی جا سکتا ہے لیکن اکثر نادان دوست کچھ بے جا جوش کی وجہ سے اور کچھ اپنے جذبۂ استعجاب کی خاطر کھوج کرید شروع کر دیتے ہیں اور اسے اجمال کی تفصیل بیان کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنی بددلی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ہر طرف نظر دوڑاتا ہے، مختلف افراد کی انفرادی کمزوریاں چن چن کر جمع کرتا ہے۔ جماعت کے نظام اور اس کے کام میں نقائص ڈھونڈتا ہے۔ اور ایک فہرست بنا کر سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہیں وہ خرابیاں، جنھیں دیکھ دیکھ کر آخر کار یہ خاکسار بددل ہو گیا ہے۔ یعنی اس کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ مجھ جیسا مردِ کامل، جو سب کمزوریوں سے پاک تھا، ان کمزور ساتھیوں اور ان نقائص سے لبریز جماعت کے ساتھ کس طرح آگے چل سکتا ہے اور یہ طرزِ استدلال اختیار کرتے وقت شیطان اسے یہ بات بھلا دیتا ہے کہ اگر واقعی معاملہ یہ تھا تو سست پڑنے کے بجائے یہ تو اور زیادہ سرگرم ہونے کے متقاضی تھا۔ جس کام کو آپ اپنی زندگی کا نصب العین ٹھہرا کر انجام دینے کے لیے اٹھے تھے، اسے اگر دوسرے اپنی خامیوں سے بگاڑ رہے تھے، تو آپ اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اسے بنانے میں لگ جاتے اور اپنی خوبیوں سے دوسروں کی ان خامیوں کا تدارک فرماتے۔ آپ کے گھر میں آگ لگی ہو اور گھر کے دوسرے افراد اسے بجھانے میں کوتاہی برتیں تو آپ بددل ہو کر بیٹھ جائیں گے یا جلتے ہوئے گھر کو بچانے کے لیے ان کوتاہ دستوں سے بڑھ کر چابک دستی دکھائیں گے۔

اس معاملے کا سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے اور اپنے آپ کو حق بہ جانب ثابت کرنے کی کوشش میں خود اپنے نامۂ اعمال کا سارا حساب دوسروں کے نامۂ اعمال میں درج کر ڈالتا ہے۔ اور بھول جاتا ہے کہ نامہ ہائے اعمال کا کوئی ریکارڈ ایسا بھی ہے، جس میں کسی کی مکاری سے ایک شوشہ بھی نہیں بدل سکتا۔ وہ دوسروں کے نامۂ اعمال میں بہت سی کمزوریاں گنواتا ہے، جن میں وہ خود مبتلا ہوتا ہے۔ وہ جماعت کے کردار میں بہت سی ان خرابیوں کی نشان دہی کرتا ہے، جن کے پیدا کرنے میں اس کا اپنا حصہ دوسروں سے کم نہیں، کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ وہ ان کاموں پر سراپا شکایت بنا ہوا نظر آتا ہے، جو اس کے

اپنے کیے ہوئے ہوتے ہیں، اور جب وہ کہتا ہے کہ یہ کچھ دیکھ کر اس کا دل ٹوٹ گیا ہے تو اس کے معنی صاف یہ ہوتے ہیں کہ ان سب چیزوں سے وہ خود بری الذّمہ ہے۔

کوئی انسانی جماعت کم زوریوں سے خالی نہیں ہوتی، نہ کوئی انسانی کام نقائص سے پاک ہوتا ہے۔ دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا اور نہ ہی ہوسکتا ہے کہ انسانی معاشرے کی اصلاح وتعمیر کے لیے فرشتے فراہم ہوں اور سارا کام معیارِ کمال کے مطابق کریں۔ کم زوریاں ڈھونڈیے تو کہاں نہ مل جائیں گی، نقائص تلاش کیجیے تو کس جگہ وہ نہ پائے جائیں گے۔ انسانی کام کم زوریوں اور خامیوں کے ساتھ ہی ہوا کرتے ہیں اور معیارِ کمال تک پہنچنے کی ساری کوششوں کے باوجود کسی ایسی حالت پر پہنچنے کی کم از کم اس دنیا میں امید نہیں کی جاسکتی جہاں انسان اور اس کا کام سبوح وقدوس ہوجائے۔

اس حالت میں اگر کم زوریوں اور خامیوں کی نشان دہی اس غرض کے لیے ہو کہ انھیں رفع کرنے اور معیارِ کمال کی طرف بڑھنے کے لیے مزید جدوجہد کی جائے تو اس سے زیادہ مبارک کام کوئی نہیں، انسانی کاموں میں جو اصلاح وترقی بھی ممکن ہے، اسی طریقے سے ممکن ہے اور اس سے غفلت تباہ کن ہے، لیکن اگر انفرادی کم زوریاں اور اجتماعی خامیاں اس لیے تلاش کی جائیں کہ انھیں کام نہ کرنے اور بددل ہوکر بیٹھ جانے کے لیے بہانہ بنانا ہو تو یہ خالص شیطانی وسوسہ اور نفسِ امّارہ کا مکر ہے۔ یہ بہانہ بہتر سے بہتر ممکن حالات میں بھی ہر حیلہ جو انسان کو مل سکتا ہے اور اس بہانے کا سدباب اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک فرشتوں کی کوئی ٹولی انسانی جماعتوں کی جگہ لینے کے لیے نہ آجائے اور اس بہانے کو پیش کرنا کسی ایسے شخص کو زیب نہیں دیتا، جو خود کم زوریوں اور خامیوں سے اپنی ذاتِ اقدس کے پاک ہونے کا ثبوت مہیا نہ کردے۔ اس طرح کی باتوں کا حاصل کبھی یہ نہیں ہوتا کہ کوئی کم زوری دور ہو یا کوئی خامی رفع ہوجائے، بلکہ یہ کم زوریوں اور خامیوں کو بڑھانے کا مجرب نسخہ ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص اسے اختیار کرکے اپنے اردگرد وپیش کے دوسرے تمام ضعیف الارادہ لوگوں کے لیے ایک غلط مثال بن جاتا ہے، وہ ان سب کو یہ راہ دکھا دیتا ہے کہ اپنے ضعف کا اعتراف کرکے نکو بننے سے بچیں، اور خود اپنے نفس کو بھی فریب دے کر مطمئن کریں۔ اس کی پیروی میں ہر بے عمل آدمی بددلی کا ڈھونگ رچانے لگتا ہے اور اس بددلی کو حق بہ جانب ثابت کرنے کے لیے ساتھیوں کی کم زوریاں اور جماعت کی خامیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک فہرست تیار کرنی شروع کردیتا ہے، پھر اس سے بدی کا ایک چکّر چل نکلتا ہے۔ ایک طرف جماعت میں عیب چینی وخوردہ گیری اور الزام وجوابِ الزام کی

ایک وبا پھوٹ پڑتی ہے، جو اس کے اخلاقی مزاج کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ دوسری طرف اچھے خاصے سرگرم عمل اور مخلص آدمی جو کسی ضعفِ ارادہ میں مبتلا نہ تھے۔ کم زوریوں اور خامیوں کے اس چرچے سے متاثر ہو کر بددلی کا شکار ہو جاتے ہیں اور جب اس مرض کی روک تھام کے لیے کچھ کیا جاتا ہے تو بددلوں کا ایک بلاک بننے لگتا ہے۔ بددلی ایک مسلک اور تحریک کی شکل اختیار کرتی ہے۔ بددل ہونا، بددل کرنا اور بددلی کے حق میں دلائل فراہم کرنا بہ جائے خود ایک کام بن جاتا ہے، اور جو لوگ اصل مقصد کے لیے کام کرنے میں سست ہو چکے تھے وہ اس کام میں خوب چستی دکھانے لگتے ہیں، یوں ان کی مری ہوئی دل چسپی زندہ ہوتی ہے مگر اس شان کے ساتھ کہ اس کا زندہ ہونا اس کی موت سے زیادہ افسوس ناک ہوتا ہے۔

یہ ایک خطرہ ہے، جس سے ہر اس جماعت کو خبردار رہنا چاہیے، جو اصلاح و تعمیر کی سعی کے لیے اُٹھے اور اس کے کارکنوں اور کارفرماؤں کو ضعفِ ارادہ کے نقصانات اور اس کی بسیط و مرکب صورتوں کے فرق اور ان میں سے ہر ایک کے اثرات و نتائج سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے اور اس کے ابتدائی آثار نمودار ہوتے ہی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔

ضعفِ ارادہ بسیط یہ ہے کہ جماعت میں کوئی شخص اس کام کو برحق اور اس کا بیڑہ اُٹھانے والی جماعت کو صحیح مانتے ہوئے عملاً سستی اور دل چسپی میں کمی دکھانی شروع کر دے۔ اس صورت کے رونما ہوتے ہی چند تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں۔

ایک یہ کہ ایسے شخص کے حالات کی تحقیق کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ اس کی سستی کی وجہ آیا ضعفِ ارادہ ہی ہے یا کچھ حقیقی مشکلات ہیں، جو اسے سست کر رہی ہیں، اگر حقیقی مشکلات پائی جائیں تو جماعت کو ان سے باخبر ہونا چاہیے تاکہ انھیں رفع کرنے میں ایک رفیق کی مدد بھی کی جائے اور اس کی سستی دوسروں کی نگاہ میں کوئی معنی بھی نہ پہن سکے، نہ کسی کے لیے غلط نظیر بن سکے اور اگر اصل سبب ضعفِ ارادہ ہی متحقق ہو تو بھونڈے طریقوں سے اجتناب کرتے ہوئے حکمت کے ساتھ ایسے شخص کے معاملے کو جماعت کے سامنے ان لوگوں کے معاملے سے ممیّز ہو جانا چاہیے، جو حقیقی مشکلات کی وجہ سے کام میں سرگرم نہ ہوں۔

دوسرے یہ کہ ضعیف الارادہ آدمی کی حالت، جس وقت بھی نوٹس میں آئے اس کے ضعف کو تذکیر و تلقین اور نصیحت کے ذریعے سے دور کرنے کی کوشش کر دینی چاہیے۔ خصوصیت کے ساتھ جماعت کے بہتر آدمیوں کو اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ اس کے

مرتے ہوئے جذبے کو اکسائیں اور عملاً اسے اپنے ساتھ لگا کر حرکت میں لانے کی سعی کریں۔

تیسرے یہ کہ ایسے شخص کو ٹوکتے رہنا چاہیے تاکہ جماعت میں اس طرح کی سستی اور بے عملی ایک معمولی چیز نہ بن جائے اور دوسرے لوگ ایک دوسرے کا سہارا لے کر بیٹھتے نہ چلے جائیں اور جماعت کے اندر وقتاً فوقتاً اس امر کا محاسبہ ہوتا رہے کہ کون وقت اور محنت اور مال کا کتنا ایثار کر سکتا ہے اور کتنا کر رہا ہے اور کس کی کارگزاری اس کی واقعی استعداد سے کیا نسبت رکھتی ہے تو پھر یہ اس شخص کے لیے کسی نہ کسی حد تک خجالت کا موجب ہوگا، جو محاسبہ کی میزان میں ہلکا اتر رہا ہو اور یہ خجالت لوگوں کو سست پڑنے سے روکتی رہے گی لیکن یہ محاسبہ اس انداز سے نہ ہونا چاہیے کہ بسیط ضعفِ ارادہ کا مریض مرکب ضعفِ ارادہ میں مبتلا ہو جائے۔ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک شخص میں جو کم زوری پیدا ہو رہی ہے اسے اگر رفع نہ کیا جا سکے تو کم از کم بڑھنے نہ دیا جائے۔ نادانی کے ساتھ ضرورت سے زیادہ جوش دکھانے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ برائی میں پڑا ہوا آدمی اس سے شدید تر برائی کی طرف زبردستی دھکیل دیا جاتا ہے۔

ضعفِ ارادہ مرکب یہ ہے کہ آدمی اپنی کم زوری پر جھوٹ اور مکر کے پردے ڈالنے کی کوشش کرے اور بڑھتے بڑھتے یہ ثابت کرنے کی کوشش پر اُتر آئے کہ خرابی اس میں نہیں ہے بلکہ جماعت میں ہے۔ یہ محض ایک کم زوری نہیں ہے بلکہ ایک بداخلاقی ہے، جسے کسی ایسے جماعت میں پھلنے پھولنے نہ دینا چاہیے، جو اخلاقی بنیادوں ہی پر دنیا کی اصلاح کرنا چاہتی ہو۔

اس کا پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی کام نہ کرنے کے لیے جھوٹے عذرات اور بے بنیاد بہانے پیش کرے، اس چیز سے چشم پوشی کرنا خود اس شخص سے بھی بے وفائی ہے، جس میں یہ اخلاقی عیب اُبھرتا آ رہا ہو اور اس جماعت سے بھی بے وفائی ہے، جس کے ساتھ بہت سے لوگوں نے ایک مقصدِ عظیم کی خاطر جان و مال کی بازی لگائی ہو۔ ایسی جماعت میں شریک ہونے والے ہر شخص کے اندر کم از کم اتنی اخلاقی جرأت اور ضمیر کی زندگی ہونا چاہیے کہ اگر اپنے جذبے کی کم زوری کے باعث وہ کام نہ کرے تو صاف صاف اپنی کم زوری کا اعتراف کر لے۔ اعترافِ قصور کے ساتھ ایک شخص کا عمر بھر اس کم زوری میں مبتلا رہنا اس سے بہ درجہا بہتر ہے کہ وہ ایک مرتبہ بھی اس کو چھپانے کے لیے جھوٹے بہانوں سے مدد لے۔ یہ عیب جب بھی ظاہر ہو اس پر سرزنش ہونا چاہیے اور کبھی اس کی ہمت افزائی نہ کی جانا چاہیے۔ علیٰحدگی میں سرزنش کرنے پر وہ اس طریقے سے باز نہ آئے تو علانیہ جماعت میں اسے ملامت کی جائے اور ان عذرات کی حقیقت کھول دی

جائے، جنھیں وہ اپنے لیے حجت بنا رہا ہو، اس میں تساہل برتنے کے معنی یہ ہیں کہ جماعت کے اندر ان خرابیوں کا دروازہ کھول دیا جائے، جن کی تفصیل ہم ابھی اوپر بیان کر آئے ہیں۔

اس کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ ایک کوتاہ عمل اور سست کار آدمی اپنی اس حالت کے لیے جماعت کے افراد کی کم زوریوں اور جماعت کے کام اور نظام کی خامیوں کو ذمہ دار ٹھہرائے اور انھیں اپنی بددلی کا سبب قرار دے۔ یہ درحقیقت خطرے کی سرخ جھنڈی ہے، جو اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اب یہ شخص فتنہ پردازی کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ اس موقعے پر اس سے بددلی کے اسباب کی تفصیل پوچھنا غلط ہے۔ یہ سوال اس سے کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے اس فتنہ کے راستے پر چلا دیا جائے، جس کے سرے پر ابھی وہ پہنچا ہے۔ یہاں اسے عیب چینی کا اذنِ عام دینے کے بہ جائے اس کے دوستوں کو اسے خدا سے ڈرانا چاہیے اور اس کو شرم دلانا چاہیے کہ خود ایک ناقص کارنامہ اور خام کردار لے کر وہ کس منہ سے دوسروں پر تنقید کی جسارت کر رہا ہے۔ محنت کرنے والے، خدمت میں سرگرمی دکھانے والے، وقت اور مال کا ایثار دکھانے والے اگر تیری کوتاہیِ عمل کو اپنے لیے بددلی کا موجب ٹھہرائیں تو حق بجانب ہوں گے، مگر تو کہاں بددلی کا روپ دھارنے چلا ہے، جب کہ بددل کرنے والی خرابیوں کو پیدا کرنے میں تیرا اپنا حصہ دوسروں سے بڑھ کر ہی ہے اور کام خراب کرنے میں تیرا اپنا عمل دوسروں کے لیے نظیر بن رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی تمام کم زوریاں اور خامیاں جماعت کے علم میں ضرور آنی چاہئیں اور جماعت کو بھی کبھی ان کے جاننے سے کترانا اور ان کی اصلاح کی سعی سے منہ نہ موڑنا چاہیے۔ لیکن انھیں بیان نہ کرنا جماعت کے ان سرگرم خادموں کا کام ہے، جو سب سے بڑھ کر خدمت میں جان لڑانے والے ہوں وہی اس کا حق رکھتے ہیں اور وہی ایمان داری کے ساتھ تنقید بھی کر سکتے ہیں۔ کسی اخلاقی تحریک میں اس بے حیائی کی ہمت افزائی نہ کی جانی چاہیے کہ کام چور لوگ جو خدمت میں سست اور کردار میں خام ہوں، وہ لمبی زبان لے کر جماعت کی خامیاں اور کم زوریاں بیان کرنے لگیں۔ ایسی تحریک میں ان کا صحیح مقام شرمندگی و ندامت اور اعترافِ قصور کا ہے ناقد اور مصلح کا نہیں ہے۔ اس مقام پر اگر وہ خود آ کر کھڑے ہوں تو یہ سخت اخلاقی بیماری کی علامت ہے اور اگر جماعت میں ان کے لیے یہ مقام تسلیم کیا جائے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جماعت پر اخلاقی دیوالیہ پن مسلّط ہو رہا ہے۔

اس سلسلے میں یہ اصولی بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ یہ ایک محرک اور متحرک جماعت کے لیے، اس کے تندرست اعضا کے احساسات کچھ اور معنی رکھتے ہیں اور بیمار احساسات کچھ اور

معنی۔ اس کے تندرست اعضاوہ ہیں، جو اپنے کام کی دھن میں لگے ہوئے ہوں، اپنا تن من دھن سب کچھ انھوں نے اس کام میں لگا دیا ہو اور جن کا نامۂ اعمال یہ بتا رہا ہو کہ وہ اپنی حدِ استطاعت تک خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کر رہے ہیں۔ بیمار اعضاوہ ہیں، جنھوں نے کبھی اپنی حدِ وسع کے مطابق خدمت کا حق ادا نہ کیا ہو یا جو کچھ عرصے تک سرگرم رہنے کے بعد ٹھنڈے پڑ چکے ہوں اور جن کا نامہ اعمال ان کی کوتاہیوں کا صریح ثبوت دے رہا ہو۔ ان دونوں کے احساسات میں وہی فرق ہے، جو تندرست آنکھ اور بیمار آنکھ کی بینائی میں ہوتا ہے۔ جماعت اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا اگر صحیح اندازہ کر سکتی ہے تو صرف اپنے تندرست اعضاء کے احساسات کے واسطے سے کر سکتی ہے۔ وہ اعضاء جو کام نہ کر رہے ہوں اور کام چھوڑنے کے لیے اپنی بددلی کا خود اظہار کر رہے ہوں کبھی اس کا قابلِ اعتماد واسطہ نہیں بن سکتے۔ ان کے احساسات اگر سو فی صد نہیں تو اسّی نوے فی صد گم راہ کن ہوں گے اور جو جماعت خودکشی نہ کرنا چاہتی ہو، وہ ہرگز ان کے دیے ہوئے احساسات پر اپنے نتائج کی بنا نہیں رکھ سکتی۔ یہ خیال کرنا کہ خامیاں اور کمزوریاں، جو بھی سامنے لا کر رکھ دے، بس گڑگڑا کر ہمیں ان کے آگے توبہ و استغفار شروع کر دینی چاہیے اور پھر انھی پر اپنے اندازوں کی بنا رکھ کے یہ فیصلہ بھی کر ڈالنا چاہیے کہ ہم کیا کچھ کرنے کے قابل ہیں اور کیا کچھ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ نیکی ہو تو ہو مگر عقل مندوں کی نہیں، سادہ لوح اور مغفل لوگوں کی نیکی ہے اور دنیا میں اس طرح کے نیک لوگوں نے نہ پہلے کچھ بنایا ہے اور نہ اب کچھ بنا سکتے ہیں۔ اپنے کمال کے زعم میں مبتلا ہو جانا جتنی بڑی نادانی ہے، اس سے کچھ کم نادانی یہ نہیں کہ اپنے نقائص اور اپنی قوتِ کار کا اندازہ ہر کس و ناکس کے بیان پر کر ڈالا جائے اور یہ نہ دیکھا جائے کہ بیان کرنے والا کس حد تک صحیح صورتِ حال سمجھنے اور بیان کرنے کا اہل ہے۔

ایک اور بات جو اس مقام پر خوب سمجھ لینے کی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک مقصد کے لیے کام کرنے والی جماعت کو اپنے سامنے اخلاق اور صلاحیتِ کار کے دو معیار رکھنے ہوتے ہیں۔ ایک معیار مطلوب، یعنی وہ انتہائی بلند معیار جس تک پہنچنے کی مسلسل جدوجہد جاری رہنی چاہیے۔ دوسرا کم سے کم قابلِ عمل ہونے کا معیار، جس کو لے کر کام چلایا جا سکتا ہو اور جس سے نیچے گر جانا قابلِ برداشت نہ ہو، ان دونوں قسموں کے معیاروں کے معاملے میں مختلف ذہنوں کے لوگ مختلف طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔

ایک ذہن اصل مقصد کے لیے کام کرنے کو چنداں اہمیت نہیں دیتا۔ کام بنے یا بگڑے یا بالکل ختم ہو جائے۔ یہ اس کے لیے کوئی زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں ہوتا وہ اس کام کو

چھوڑ کر بھی مزے سے جی سکتا ہے اور کام میں شریک رہ کر بھی اس طرح شرکت کر سکتا ہے کہ اس کے وقت، مال اور قوتوں کو جونک نہ لگنے پائے۔ یہ ذہن بسا اوقات فکر و نظر کی عیاشی کے طور پر اور کبھی اپنے فرار کے لیے پر فریب معذرت کے طور پر اخلاق کے آسمانوں پر اُڑتا ہے اور معیارِ مطلوب سے کم پر کسی طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ اس سے کم جو کچھ بھی نظر آتا ہے اس پر وہ بڑی بے چینی اور بد دلی کا اظہار کرتا ہے مگر یہ بے چینی کام کے لیے نہیں کام سے فرار کے لیے ہوتی ہے، خواہ یہ فراری ذہنیت شعوری ہو یا غیر شعوری۔

دوسرا ذہن اگرچہ مقصد اور اس کے لیے کام کرنے کو بڑی اہمیت بلکہ پوری اہمیت دیتا ہے۔ مگر تخیل پرستی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے معیارِ مطلوب اور کم از کم قابلِ عمل ہونے کے معیار کا فرق ٹھیک ٹھیک ملحوظ نہیں رکھتا، یہ خود بھی بار بار الجھن میں پڑتا ہے اور پہلے قسم کے ذہن کی چھوت بڑی آسانی سے اس کو لگ جاتی ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو بھی پریشان کرتا ہے اور کام کرنے والوں کے لیے اچھی خاصی پریشانیوں کا موجب بن جاتا ہے۔

تیسرا ذہن وہ ہوتا ہے، جسے مقصد کے لیے کام کرنا اور کام چلانا ہوتا ہے اور جسے اس کام کے بناؤ اور بگاڑ کی پوری ذمے داری اپنے اوپر ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اسے اس کا مقام خود ہی اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہر وقت دونوں قسموں کے معیاروں کا ٹھیک ٹھیک فرق ملحوظ رکھتے ہوئے کام کرے اور یہ دیکھتا رہے کہ مقصد کی طرف پیش قدمی کی رفتار کسی معقول اور وزنی سبب کے بغیر متاثر نہ ہو۔ وہ معیارِ مطلوب کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔ اس تک پہنچنے کی فکر سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ اس سے گری ہوئی ہر چیز پر سخت تشویش محسوس کرتا ہے۔ مگر کم سے کم قابلِ عمل معیار سے کام چلاتا رہتا ہے اور اس معیار سے گر جانے والے لوگوں کی وجہ سے اپنی اسکیم بدلنے کے بہ جائے انھیں ہٹا کر پھینک دینا زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس کے لیے اپنی طاقت کا صحیح اندازہ لگانا اور اس کے مطابق کام کے پھیلاؤ اور اس کی رفتار میں کمی بیشی کرنا تو بے شک ضروری ہے۔ اس میں وہ غلطی کر جائے تو اپنے مقصد کو نقصان پہنچا دے، لیکن سخت نادان ہوگا وہ شخص، جو اس چیز کا اندازہ لگانے میں پہلی اور دوسری قسم کے ذہنوں سے رہ نمائی حاصل کرے، اس کے لیے اگر مددگار ہو سکتے ہیں تو تیسری قسم کے ذہن ہی ہو سکتے ہیں اور ان کی معرفت اسے حاصل ہونا چاہیے۔